بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیسرا ہاتھ

(افسانوں کا مجموعہ)

لبوں پر مہر خاموشی لگی ہے
دلوں میں بند ہیں کتنے فسانے

سرور عالم راز سرورؔ

8020 Moss Rock Drive

Fort Worth, TX, U.S.A.

البلال اکادمی پبلشرز
کراچی، پاکستان

حرف آغاز

بزم ہستی ایک حقیقت::::اور حقیقت ہے افسانہ

(رازؔ چاندپوری)

میرے افسانوں کے مجموعے کے اس مختصر سے دیباچہ کا مقصد بھی اسی کی طرح مختصر اور محدود ہے۔ میری افسانہ نگاری کی قلیل العمری اور میری ادبی وشعری کاوشوں کی سبک مایگی سے قطع نظر اپنی تخلیقات پر کسی قسم کی رائے زنی بجائے خود خطرہ سے خالی نہیں ہے اور عقل سلیم کا تقاضہ ہے کہ یہ کام دوسروں پر چھوڑ دیا جائے۔ جہاں تک اردو افسانہ نگاری پر نقد ونظر، اس کے ارتقاء اور رجحانات، قدیم قصہ نویسی اور جدید افسانہ نگاری کے فرق اور دونوں کے محرکات وپس منظر، اردو ادب وشعر پر افسانہ نگاری کے اثرات اور ایسے ہی دوسرے موضوعات کا سوال ہے، ان پر تبصرہ میرا مقام نہیں ہے۔ دوسروں نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا ہے اور آئندہ بھی یہ کام ہوتا رہے گا۔ چنانچہ یہ دیباچہ زیر نظر افسانوں کے بارے میں چند وضاحتوں تک ہی محدود ہوگا۔ اگر ان چند سطور سے قارئین پر میری افسانہ نگاری کے محرکات اور پس منظر واضح ہو جائیں اور اگر ان کہ ان افسانوں میں اپنی یا دوسروں کی روزمرہ کی زندگی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آ جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

میری افسانہ نویسی کی عمر نہایت کم ہے۔ پھر بھی یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شعر وادب کا ذوق وشوق مجھے ورثہ میں ملا ہے۔ والد مرحوم حضرت ابولفاضل رازؔ چاندپوری (تلمیذ مولانا سیمابؔ اکبرآبادی) کا شمار برصغیر ہندوپاک کے مشاہیر شعرا میں ہوتا تھا اور ان کی تخلیقات ملک کے تقریباً'' تمام موقر رسائل وجرائد میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور کے بعد کچھ تو برصغیر کے انقلابی حالات اور ان کے نتیجہ میں دنیائے ادب پر مرتب ہونے والے اثرات سے مجبور ہو کر اور کچھ اپنی فطری خاموش طبعی کے تقاضہ کے احترام میں وہ کم وبیش گوشہ نشین ہو کر بیٹھ رہے تھے اور دنیائے اردو سے ان کا عملی رابطہ کمزور ہو گیا تھا، ورنہ بچپن میں گھر کا ماحول والد مرحوم کی گوناگوں ادبی وشعری سرگرمیوں سے نغمہ ریز اور کیف پرور تھا۔ ان کے بیشتر احباب یا تو خود ادیب وشاعر تھے یا ادب وشعر کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ والد مرحوم کی اکثر شامیں انہیں ادب نواز اور مہذب دوستوں کی معیت میں گذرتی تھیں۔ دوسرے بھائیوں کی طرح میں بھی اس شائستہ ماحول اور ایسے بزرگوں کے فیضان صحبت سے مالا مال ہوا اور یہیں سے میرے ادبی ذوق کی ابتداء ہوئی۔ چونکہ والد مرحوم اصلاً'' شاعر تھے، میرا رجحان طبع بھی شروع سے شاعری کی جانب ہی رہا۔ میں نے شعر گوئی تقریباً'' تیرہ سال کی عمر سے شروع کر دی تھی اور یہ سلسلہ حالات و حادثات سے متاثر ہو کر وقتاً'' فوقتاً'' معرض التوا میں پڑے رہنے کے باوجود بفضلہٖ آج تک جاری ہے۔ اس شوق کا نتیجہ میری غزلیات کے تین مجموعوں (: شہر نگارؔ، : رنگ گلنارؔ: اور: درشہوارؔ:) کی صورت میں منصۂ شہود پر ظاہر ہو چکا ہے۔

امریکہ میں میرا مستقل قیام ۱۹۷۱ء سے ہے۔ اس سے قبل قیام ہندوستان کے دوران اور پھر امریکہ پہنچ کر نثر نگاری میں کچھ عرصہ کاغذ سیاہ کئے تھے لیکن اس منزل ہفت خواں میں سنجیدگی سے کوشش وکاوش کا خیال مجھ کو دراصل ۱۹۹۶ء میں ہوا۔ امریکہ میں اردو زبان وادب کی تہذیب، ترویج اور اشاعت کے وسائل نہایت محدود ہیں۔ اکثر وبیشتر مقامات پر اہل ذوق کا فقدان ہے اور سنجیدہ تحقیقی وتنقیدی کام کے مواقع اور ذرائع کم وبیش ناپید ہیں۔ ان سب حالات نے مل کر مجھ کو افسانہ نگاری کی جانب مائل کیا۔ ذرا سا ذہن و دماغ پر زور دیا تو اپنے چاروں طرف افسانے ہی افسانے نظر آئے۔ قدم قدم پر سیکڑوں پلاٹ کاغذ پر آنے اور خدا جانے کتنے کردار اپنی جولانیاں دکھانے کے لئے بے چین تھے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''حقیقت اپنی فطرت میں افسانہ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔'' اپنی ہندوستان اور امریکہ میں گذری زندگی دیکھی اور دوسروں کی زندگیوں پر نظر ڈالی تو ایسی ایسی حقیقتوں نے دامن دل اپنی جانب کھینچا جو ہر طرح سے ایسے افسانوں اور کہانیوں پر بھاری تھیں جن کی اختراع اور تراش خراش میں میرے ذہن وقلم کو معلوم نہیں کتنے صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑتا۔ اپنے تجربات ومشاہدات، دوسروں پر بیتے واقعات، راہ چلتے ہوئے نگاہوں سے گذرے ہوئے مناظر وحادثات، امریکہ کی غیر مانوس اور جارحانہ فضا سے مجروح اور نبرد آزما اپنے ہم وطنوں کی کشمکش، غرضیکہ جس طرف نظر اٹھ جاتی تھی ایک نیا افسانہ اپنی طرف توجہ مبذول کرتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ کیفیت تھی کہ:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں ایں جاست!

چنانچہ میرا یہ فیصلہ کہ میرا ہر افسانہ کسی ایسے واقعہ، تجربہ یا مشاہدہ پر مبنی ہوگا جو میری اپنی یا کسی دوست کی زندگی سے وابستہ ہوگا یکسر آسان اور فطری تھا۔

میرا خیال ہے کہ وہ افسانہ جو ہماری روزمرہ کی زندگی اور اس کی کامرانیوں اور نامرادیوں کی بازگشت نہ ہو اور کسی خیالی دنیا کی عکاسی کرتا ہو ہمیں اس طرح متاثر نہیں کر سکتا ہے جس طرح ایک اچھے افسانہ کو کرنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ حقیقت نگاری اچھی افسانہ نگاری کے لئے اشد ضروری ہے۔ میرا رجحان حقیقت نگاری کی ہی جانب ہے اور اس سلسلہ میں پلاٹ، کردار اور زبان و بیان سب کو حقیقی اور روزمرہ کی زندگی کے قریں رکھنا پسند کرتا ہوں۔ بازار کے سبزی فروش کنجڑہ سے لکھنؔو اور دہلؔی کی شستہ اور شائستہ، شین قاف سے درست زبان کہلوانا ایسا ہی مضحکہ خیز سمجھتا ہوں جیسے افسانہ کے کسی کردار کے ''دل بدل'' (Heart Transplant) آپریشن کے نتیجہ میں یہ تصور قارئین کے سامنے پیش کرنا کہ اس عمل کی وجہ سے مذکورہ کردار کا ذہن ہ دماغ، اخلاق و کردار بدل کر اس شخص کے ہو جاتے ہیں جس کا دل اس کے سینہ میں لگایا گیا ہے!

زیر نظر مجموعہ کا ہر افسانہ میرے اسی مندرجہ بالا احساس و خیال کی لفظی تعبیر ہے۔ مصلحت اور ضرورت نے افسانوں کے کرداروں اور مقامات وغیرہ کے نام اور بعض تفصیلی حالات بدلنے پر مجبور کیا ہے ورنہ نفس افسانہ ہر جگہ ایک ایسی کہانی سناتا ہے جو زندگی اور اس کے حقائق کی صورت میں میرے احساس و نظر کو دعوت فکر دے چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ افسانے ہماری روزمرہ کی زندگی سے اس قدر قریب ہیں کہ اگر ان میں قاری کو اپنی یا کسی اپنے کی جانی پہچانی شکل نظر آ جائے تو چنداں حیرت کا مقام نہیں ہوگا!

میں مکرمی نکہتؔ بریلوی صاحب (مدیر ''افکار'' و ''روشنائی'' : کراچی، پاکستان) کا انتہائی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری ہمت افزائی کیا اور قدم قدم پر دست عنایت بڑھا کر اس مجموعہ کی اشاعت کی ساری منزلوں سے بخیر و خوبی عہدہ برآ کرانے میں میری ہر ممکن دست گیری کی۔ میں ان کے حق میں دعائے خیر کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں!

آخر میں اپنی اہلیہ قیصؔر رازی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ میری ادبی و شعری کوششوں میں ہمیشہ میرے قدم بقدم چلی ہیں۔ ان کی ہمت افزائی، دل سوزی اور خندہ پیشانی نے ہر منزل پر مجھ کو حوصلہ اور روشنی سے آشنا رکھا ہے، اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ مجموعہ اس جاں فزا سلسلہ کے لئے حرف آخر کا حکم نہیں رکھتا ہے:

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

سرور عالم راز سرورؔ
فورٹ ورتھ، ٹیکساس، امریکہ
یکم اگست ۲۰۰۴ء

کہانی کا کوزہ گر: سرور عالم راز

احمد زین الدین

جدید اردو کہانی کے موسس تو پریم چندؔ ہی ہیں مگر ان سے پہلے مغرب میں رومانیت کی تحریک کے زیر اثر ایک عرصہ تک رومان پرستی کا چرچا رہا، جس سے متاثر ہو کر جن ادیبوں نے ترجموں اور مغرب کہانیوں کے adaptations یا خود تخلیق کئے ہوئے رومانی افسانوں سے ہمارے ادب کو روشناس کرایا وہ بھی جدید افسانہ نویسی کے بنیاد گذاروں میں شامل ہیں۔ مغرب سے مستعار اس صنف کو اس جانکاہی نے مقبولیت عطا کی اور ایک طویل عرصہ تک رومانی افسانوں کی جادوگری نے قاری کے ذہن کو ان کی طلسماتی فضا کے رنگ و نور اور جذب و کیف کا عادی بنائے رکھا۔ اسے ہم داستانی دور کی توسیع سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس دور کے عظیم تخلیق کاروں کی زندہ تحریروں کو ہم آج بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ مگر صنعتی انقلاب کی کرشمہ سازی اور وقت کی نئی کروٹ نے رومانی اور جذباتی تحریروں کی وقعت کو کم کر دیا، فکر و احساس میں تبدیلی رونما ہوئی، سوچ کا انداز بدلا اور انسانی مسائل کو اولیت دی جانے لگی۔ اس نئے منظر نامے میں پریم چندؔ اور ان کے بعد کے لکھنے والوں نے سماجی حقیقت نگاری کی راہ اپنا کر جو کارہائے نمایاں انجام دئے ان کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پریم چندؔ نے دیہی زندگی کے مسائل اور ان سے جڑے ہوئے عام انسانوں کے دکھوں کی جو دل پزیر کہانیاں بیان کیں اس سے اس دور سماج کی سچی تصویریں ہمارے سامنے آئیں۔ دردمندی کے گہرے احساس نے انسان کو انسان سے قریب تر کیا اور معاشرہ کے سارے دکھ سانجھے کے دکھ بن گئے۔

تحریک آزادی نے زبان بندی کی زنجیریں کاٹیں اور آزادانہ غور و فکر کے سارے بند دروازے ادیبوں پر کھل گئے۔ تاریکی چھٹتے ہی روشنی کے ساتھ تازہ ہوا کے جھونکے نے دلوں میں ایک نئی امنگ پیدا کی۔ ترقی پسند تحریک نے سماجی حقیقت نگاری اور عوام کے دکھوں کو دور کرنے اور استحصالی قوتوں سے نجات دلانے پر زور دیا۔ ادب اور سماج کے رشتہ کو مستحکم کیا اور ادب برائے زندگی کی اہمیت پر زور دیا۔ کہانی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ اس انداز نظر کی کہانیاں لکھنے والوں نے اعتبار حاصل کیا۔ درمیانی عرصہ میں کئی جھکڑ بھی چلے۔ بے راہ روی اور نئے تجربہ کی آرزومندی نے منزل سے بھٹکایا بھی مگر بے یقینی اور گومگو کی کیفیت زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہی۔ بالآخر نئے طرز احساس اور تجربوں کی بو قلمونی نے بیانیہ کو زیادہ توانا بنا دیا۔

جدیدیت کے رجحان نے کہانی میں نئی سمت کی جانب پیش رفت کی اور پیچیدہ علامتوں کے جھکڑ نے پلاٹ، کردار، وحدت تاثر اور جزیات نگاری کے پرزے اڑا دئے۔ اتنا ضرور ہوا کہ سیاسی جبر کے زمانہ میں ان علامتوں نے مشکل موضوعات پر قلم اٹھانے اور مزاحمتی رویہ اختیار کرنے کا حوصلہ پیدا کیا مگر غیر مانوس علامتوں نے قاری کی تفہیم میں مشکلات پیدا کیں اور عدم ترسیل نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا۔ نتیجہ علامتی کہانی سے عدم دلچسپی کی صورت میں نکلا۔ اس طرح بیانیہ کہانی کو اس کی گم کردہ راہ دوبارہ مل گئی۔

فکشن کو A Paradise of loose Ends کہا جاتا ہے، یعنی یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کی کوئی چار دیواری یا حد بندی نہیں ہوتی۔ مگر اس کے باوجود وہ فن کے ایک مخصوص دائرہ میں مقید ہوتی ہے اور اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ ہر اچھے لکھنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ فن کے مخصوص دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی شناخت اور پہچان قائم کرے لیکن یہ آرزومندی مسلسل ریاضت اور متنوع فکر و احساس کے ذریعہ کڑے کوس کا سفر طے کرنے کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اس منزل تک رسائی ''نیش عشق'' گوارا کرنے اور وقت کی بھٹی میں جلنے کے بعد ممکن ہوتی ہے، تب کہیں جا کر سرخ روئی ملتی ہے۔ مگر یہ کسی کسی کے حصہ میں ہی آتی ہے۔

جدید ادب کی اصل پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے عہد، اپنے ماحول، سیاسی حالات و واقعات اور سماجی اتھل پتھل کی صحیح عکاسی کرے۔ اس کے گرد و پیش میں جو انتشار ہے اس کے کرداروں پر پڑنے والے نفسیاتی عوامل کے جو اسباب ہیں ان کی نشاندہی کرے۔ اب زندگی کا مسئلہ صرف روزی روٹی تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس میں فلسفیانہ موشگافی اور پیچیدہ انسانی رویہ کے ساتھ ذہنی انتشار بھی شامل ہو گیا ہے۔ محبت اور نفرت کا معیار بدل گیا ہے۔ بے محابہ بدلتی انسانی قدروں اور سائنسی ایجادات کی حیرت انگیز کرشمہ سازیوں

نے انسانی رویوں کو یکسر بدل دیا ہے۔ آج کا انسان خود مرکزیت کا شکار ہے، مادیت پرستی نے اس ساری آسائشیں دے کر اندر سے تنہا اور کھوکھلا کر دیا ہے۔ رحم دلی کے جذبہ نے منافقت کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس اندرونی بھونچال کے نتیجہ میں وہ خود اپنے آپ کو سمجھنے میں بڑی حد تک ناکام نظر آتا ہے۔ غالباً ''یہی وجہ ہے کہ آج کے لکھنے والوں کے انداز نظر بھی بدل رہے ہیں۔ کہانی لکھنے کے جو بندھے ٹکے اصول اور پیمانے تھے ان پر عمل کرنا اب ضروری نہیں رہا، مگر اس کے باوجود کہانی میں کہانی پن ضرور ہونا چاہئے۔ دردمندی کے احساس کے بغیر کہانی کی ترسیل ممکن نہیں ہے۔

کہانی کے اس ارتقائی تناظر میں انسانی زندگی کے مسائل پر گہری نگاہ کرنے اور اس کے مختلف رویوں کو گرفت میں لانے کا فریضہ سرورؔ عالم رازؔ نے بڑی خوبی سے سر انجام دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ انسانی کمزوریوں اور زندگی کی بوالعجبیوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ انہوں نے زندگی کے مشاہدے اور تجربہ کی کڑی دھوپ سے گذرتے ہوئے ہر اذیت ناک لمحہ کو تخلیق کی آنچ سے گذارا ہے اور اسے کہانی کا پیکر عطا کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کا تانا بانا چھوٹے چھوٹے بظاہر معمولی واقعات سے بنا گیا ہے مگر اس میں بھی بڑی اثر پذیری کی کیفیت موجود ہے۔ انہوں نے کسی منصوبے کے ماتحت بڑے موضوعات پر قلم نہیں اٹھایا ہے مگر ان کی بعض کہانیوں میں بڑا ہونے کی خصوصیت موجود ہے۔

سرورؔ عالم رازؔ کی کہانیوں میں دردمندی کا احساس پوری شدت سے موجود ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ شاعری انہیں اپنے والد بزرگوار حضرت رازؔ چاندپوری سے جن کا شمار برصغیر ہندوپاک کے مشاہیر ادبا و شعرا میں ہوتا ہے، ورثہ میں ملی ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''**شہر نگار**'' کراچیؔ سے ہی شائع ہو کر اعتبار حاصل کر چکا ہے۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری کی طرف سنجیدہ کوشش کا آغاز ۱۹۹۶ء میں کیا۔ وہ ۱۹۷۱ء سے امریکہؔ میں مقیم ہیں جہاں بقول ان کے ''اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے وسائل محدود ہیں، سنجیدہ تحقیقی اور تنقیدی کام کے مواقع تقریباً ناپید ہیں اور اہل ذوق کا فقدان ہے۔'' مگر ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ سوچنے والا ذہن اور بے حد حساس دل رکھتے ہیں۔ مطالعے اور علمیت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ مخدومی رشید احمدؔ صدیقی جیسے نابغہء روزگار ادیب بے مثل کی ادبی فضاؤں کے خوشگوار جھونکوں کے منت کش ہیں۔ چنانچہ اپنے اندر کے کرب، طبیعت کی اپج، فکر و خیال کے نالے اور فطری جولانی کو کہاں تک پابند نے کر سکتے تھے! ملازمت سے سبکدوش ہو کر انہوں نے افسانہ نگاری کو اپنایا۔ ذہن رسا اور فکر جویا نے ان سے بڑی خوبصورت کہانیاں لکھوائیں۔ زندگی کے گہرے مشاہدے اور وسیع تجربے نے یادوں کے کھنڈر آباد کئے۔ مشرق کی پروائی اور مغرب کی یخ بستہ ہواؤں نے ذہن کے دریچے وا کئے اور تخلیق کی رت نے جسم و جان میں سرشاری بھر دی۔ پھر یادیں ذہن کو لے اڑیں۔ اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں ان کا خیال ہے:

''وہ افسانہ جو ہماری روزمرہ کی زندگی اور اس کی کامرانیوں اور نامرادیوں کی بازگشت نہ ہو اور کسی خیالی دنیا کی عکاسی کرتا ہو ہمیں اس طرح متاثر نہیں کر سکتا ہے جس طرح ایک اچھے افسانہ کو کرنا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ حقیقت نگاری اچھی افسانہ نگاری کے لئے اشد ضروری ہے۔ میرا رجحان حقیقت نگاری کی ہی جانب ہے اور اس سلسلہ میں پلاٹ، کردار اور زبان و بیان سب کو حقیقی اور روزمرہ کی زندگی کے قریں رکھنا پسند کرتا ہوں۔ بازار کے سبزی فروش کنجڑہ سے لکھنؤ اور دہلی کی شستہ اور شائستہ، شین قاف سے درست زبان کہلوانا ایسا ہی مضحکہ خیز سمجھتا ہوں جیسے افسانہ کے کسی کردار کے ''دل بدل'' (Heart Transplant) آپریشن کے نتیجہ میں یہ تصور قارئین کے سامنے پیش کرنا کہ اس عمل کی وجہ سے مذکورہ کردار کا ذہن و دماغ، اخلاق و کردار بدل کر اس شخص کے ہو جاتے ہیں جس کا دل اس کے سینہ میں لگایا گیا ہے!''

ان کی اس بلیغ اور دوٹوک رائے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقت کو افسانہ بنانے کے فن کے قائل ہیں اور افسانہ میں روزمرہ کی بول چال کو برتنے پر زور دیتے ہیں۔ گویا افسانہ کے رموز سے واقف ہیں۔ لیکن حقیقت کو صرف افسانوی انداز میں بیان کر دینے سے وہ Fantasy پیدا نہیں ہو سکتی ہے جو اچھی کہانی کے لئے نہایت ضروری خیال کی جاتی ہے۔ ادب نامعلوم سے معلوم کے سفر کی راہ متعین کرتا ہے۔ علامت، رمز اور کنایہ اس کے بنیادی عناصر میں شامل ہیں۔ ادھورا انکشاف اس کا وصف ہے۔ تراشیدہ کہانی تو کرافٹ اسٹوری کے زمرہ میں آتی ہے، مگر فطری کہانی پن کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یعنی جو مجموعی تاثر کے ذریعہ ذہن کو تادیر سوچنے پر مجبور کرے۔

سرورؔ عالم رازؔ نے سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی ماحول کے گہرے مشاہدے کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے انسانی کمزوریوں، منافقانہ رویوں، مذہبی شعبدہ بازیوں اور جاگیردارانہ نظام کی بوالعجبیوں کو نشانہ بنایا ہے۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اسے کہانی کا روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کہانی ''**توکلت علی اللہ**'' میں حاجی صاحب کا کردار بے ایمانی کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ ''**میلاد شریف**'' میں حاجی صاحب بجلی چرا کر اور بجلی گھر والوں کو رشوت (دستوری) دے کر میلاد کرواتے ہیں۔ ذاتی نام و نمود کی خاطر ناجائز کام کرتے ہیں اور مذہب کی آڑ لے کر معصوم لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ''**پال جونزؔ کا قرض**'' میں قرض کی عدم ادائیگی پر فادر جانؔ اپنے ہی مذہب کے ایک پیروکار کو تلقین کرتے ہوئے ایک ایسا جملہ لکھتا ہے جو مسلمانوں کی بداعمالی اور بدکرداری پر گہرا طنز ہے مگر جس سے قرض کی رقم واپس مل جاتی ہے۔ وہ جملہ یہ ہے ''بھائی پالؔ! تم مسلمان کب سے ہو گئے ہو؟'' کہانی ''**ناوے سال کا پھیر**'' میں عورتوں پر دوسری شادی نہ کرنے کا جبر کیا جاتا ہے اور مذہب و مسلک کی

آڑ میں غلط رسم کی پیروی کی جاتی ہے۔اسی طرح ''**تیسرا ہاتھ**'' میں مرد کی بے وفائی پر عورت کے انتقام کو دکھایا گیا ہے۔اسی طرح ان کی دوسری کہانیوں میں بھی کسی نی کسی مسئلہ کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جس سے قاری متاثر ضرور ہوتا ہے۔البتہ فن کی کسوٹی پر ان کی یہ کہانیاں کہاں تک اترتی ہیں، یہ ابھی طے ہونا ہے۔

انہوں نے افسانے کی زبان، کرداروں کے عادات واطوار اور بول چال کو فطری انداز میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ان کی کہانیوں کا ماحول ہندوستانی ہونے کے علاوہ غیر ملکی سرزمین سے بھی تعلق رکھتا ہے جہاں وہ بسلسلہء روزگار مقیم رہے ہیں۔انہوں نے کرداروں کی فطری روش، عام زندگی سے ان کی گہری وابستگی، مقامی بولی ٹھولی اور بگڑی ہوئی زبان کے محاوروں کو موقع کی مناسبت اور حالات و ماحول کو پیش نظر رکھ کر بڑے برمحل انداز میں استعمال کیا ہے جس سے انسانی سوچ کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ جزئیات نگاری بھی بڑے موثر انداز میں کی گئی ہے مگر بعض اوقات کرداروں کی نفسیات کو ابھارنے میں غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے جس سے مجموعی تاثر مجروح ہوتا ہے۔

سرؔور عالم رازؔ کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسرا ہاتھ'' بیس کہانیوں پر مشتمل ہے جن میں انہوں نے آج کے سماج کے مختلف النوع مسائل، انسانی کردار کی کمزوریوں اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو پیش نظر رکھ کر کہانیاں بنی ہیں۔انہوں نے انسانی جذبوں کو لفظوں کے ذریعہ بڑی دردمندی سے تسخیر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ابھی ان کا ابتدائے عشق ہے مگر والہانہ پن اور اس راہ کی صعوبتیں جھیلنے کے عزم کا اظہار اس بات کی گواہی دینے کے لئے کافی ہے کہ وہ پابجولاں منزل کو پا لینے کی للک (آرزو) رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اہل نظر میں اس مجموعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

احمؔد زین الدینؔ

مدیر روشنائی، کراچی، پاکستان

یادوں کے مینار

رات کے گھنگور اندھیرے میں غُراتی، گڑگڑاتی، سیٹی بجاتی ٹرین اپنی منزل مقصود کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ کرتے پہیوں کی ہر گردش مجھے اپنے وطن سے قریب کرتی جاتی تھی اور میں تھا کہ ہزاروں خیالوں کی یورش کا شکار، رات بھر کا جاگا، کھڑکی سے سر لگائے باہر اندھیرے میں خالی خالی آنکھوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ ٹرین کی ہر کھٹ کھٹ کھٹاک پر میرا دل اچھل کر حلق میں آ پھنستا تھا اور ہر اسٹیشن پر کھڑکی کے میلے شیشہ کے اُس پار پلیٹ فارم کی بیمار روشنی میں جنم جنم کی پیاسی آنکھیں معلوم نہیں کیا ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے اندھے سائے، قلیوں اور خوانچہ والوں کی لہراتی ہوئی آوازیں چند منٹ کے لئے اِرد گرد کے ماحول کو جگا دیتی تھیں۔ پھر ایک ہچکولے کے ساتھ ٹرین اپنا فسانہ دہرانے لگتی تھی: کھٹ کھٹ کھٹاک! کھٹ کھٹ کھٹاک!

آج دماغ نے یادوں کے سارے دریچے کھول دئے تھے۔ پچاس سال پرانے گلی، کوچے، بازار اور دوست آشنا اپنے اپنے چہرے سے آدھی صدی کی گرد جھاڑ کر میرے سامنے آ کر کھڑے ہو رہے تھے اور میں ان کی توانائی دیکھ کر پریشان تھا۔ انہیں تو کب کا مسمار ہو کر مڑ جانا چاہئے تھا مگر یہ تو اپنی مسکراتی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر جیسے مجھ کو دیوانہ بنانے پر تلے ہوئے تھے:

''کیوں، کہاں چلے گئے تھے تم؟ آج ہم تمہیں کیسے یاد آ گئے؟ ہم تو تمہیں نہیں بھولے پیارے! اب آئے ہو تو کچھ دن رہ جاؤ۔ زندگی کا کیا بھروسہ، معلوم نہیں پھر تم آؤ کہ نہ آؤ۔''

اور میں رندھے گلے سے ان کو جواب بھی نہیں دے پا رہا تھا۔ شاید ایسی باتوں کا کوئی جواب ہوتا بھی نہیں ہے!

لو! ٹرین مانکؔ پور سے چل پڑی۔ اب مجھؔ گاؤں آئے گا، پھر ستنؔا، کٹنؔی، سیہورؔا اور پھر جبلؔ پور! میرا وطن! وہاں بابو جیؔ اور بواؔ کے پر شفقت سایہ میں بچپن کی کتنی سہانی صبحیں گذاری تھیں۔ ہم والد مرحوم کو بابو جیؔ اور والدہ مرحومہ کو بواؔ کہتے تھے۔ آنکھ کھولی تو ساری دنیا ان کو یہی کہتی تھی چنانچہ ہم بھی کہنے لگے۔ بچپن کے وہ شب و روز جن سے زندگی معتبر معلوم ہوتی تھی کب کے غائب ہو چکے تھے۔ بابو جیؔ اور بواؔ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور میں وطن تو کیا ملک بھی چھوڑ کر امریکہ جا بسا تھا۔ آج پچاس سال کے بعد میں پھر جبل پورؔ جا رہا تھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کے اس سفر پر میں عمر بھر چلتا رہا ہوں۔ مانک پورؔ، ستنؔا، کٹنؔی، سیہورؔا، جبل پورؔ!

کیسے پیارے لوگ تھے وہ بھی! بابو جیؔ نرم گفتار، کم گو، سرتاپا شفقت! خلیق ایسے کہ کیا چھوٹا، کیا بڑا، یہاں تک کہ نائی، دھوبی اور قصائی سے بھی آپ اور جناب سے گفتگو کرتے تھے۔ وقت کے ایسے پابند کہ صبح دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلتے تو سامنے پنواڑی کی دوکان پر بیٹھے لوگ گھڑی ملاتے ''باؤ جیؔ دپھتر جا رہے ہیں۔ سوا نو بجا ہے۔'' شرافت اور وضعداری کے پُتلے تھے۔ کہیں جاتے تو زندگی کی ریت پر ہمارے لئے چند لکیریں کھینچ جاتے:

''دن بھر گھر سے باہر مارے مارے نہ پھرئے گا۔ آپس میں لڑائی نہ کیجئے گا۔ باہر جائیں تو اچھے لوگوں میں بیٹھئے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ گھر میں بیٹھ کر کچھ لکھئے پڑھئے۔''

اُدھر بواؔ تھیں، محبت اور ممتا کی دیوی، سارے محلّہ میں ہر دل عزیز، ہر ایک کی پیاری، اللہ کی محبت اور عبادت سے سرشار۔ اِدھر بابو جیؔ گئے اور اُدھر وہ اپنا موٹی ململ کا ہلکا گلابی دوپٹہ اتار کر اُن لکیروں پر ڈال دیتیں اور ہم اُچھلتے کودتے ان کو پھلانگ جاتے۔ دن بھر دھما چوکڑی کے بعد پھر شام کو گھر میں داخل ہوتے، بواؔ لکیروں پر سے دوپٹہ اٹھا کر سر پر رکھ لیتیں اور عصر کی نماز ادا کرنے کھڑی ہو جاتیں۔ بابو جیؔ آتے تو ہم ایسے سیدھے سادے سادھو بنے بیٹھے ہوتے جیسے منھ میں دانت ہی نہ ہوں۔

چار کمروں کا وہ گھر، وہ لق و دق آنگن، وہ چھوٹا سا باورچی خانہ جو اپنے اندر ایک دنیا رکھتا تھا۔ اس آنگن میں ہم دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ دیواروں پر چونے سے تین لکیروں کا وکٹ، ایک پرانی گھسی پٹی ٹینس کی گیند اور جلاؤ لکڑی کے تختہ کا بلا! وہ گھمسان کا کھیل جمتا کہ اللہ اکبر! وہ آف بریک آئی! وہ چوا لگا!

''دوڑ، ابے دوڑ، رن کیوں نہیں بناتا؟ بالکل صاف آؤٹ ہو گیا، بال وکٹ پر لگی ہے! ابے جا، آیا وہاں سے آؤٹ کرنے والا۔ سالا دھاندلی کرتا ہے۔''

یونہی کھیلتے اور لڑتے دن ڈوب جاتا اور دوسرے دن ہرانے کی دھمکیاں دیتے ہوئے بچے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ اسی آنگن کی دیواروں سے لگی کیلوں میں ستلی

باندھ کر نیٹ بناتے تھے اور چار پیسے کی گھٹیا چڑیا خرید کر مانگے تانگے کے رَیکٹ سے بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ چڑیا نیٹ کے اوپر سے گئی کہ نیچے سے، سروِس ٹھیک تھی کہ نہیں! خوب ہی تو بحث ہوتی۔ دبی زبان سے دو ایک موٹی موٹی گالیوں کا تبادلہ بھی ہوتا، مگر دوسرے ہی لمحہ ساری گرمی چڑیا کی اڑان میں غائب ہو جاتی۔ آخر کل بھی تو کھیلنا تھا!

اور ہاں اسی لق و دق آنگن میں پتنگ کا مانجھا بھی سُوتا جاتا تھا۔ دو نمبر کی رِیل کا دھاگا دروازہ کی کُنڈی میں سے ہوتا ہوا، دیواروں کی کیلوں میں تانا بانا بنتا کمرہ کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا۔ وہاں سے باورچی خانہ کی الماری سے الجھتا ہوا واپس آنگن میں آ جاتا اور مَیں باریک شیشہ سے بھری گلابی رنگ کی لُگدی لئے جھما جھم مانجھا سونتتا: ''اہاہا! اب مزا آئے گا۔ کیا تیز مانجھا ہے! وہ پیچ کاٹوں گا کہ لوگ یاد رکھیں گے!''

مگر پھر یہ ہوتا کہ ہمیشہ کی طرح بڑے بھائی مشہؔود کے سے میری پتنگ اور چرخی چپکے سے باہر لے جاتے اور تھوڑی دیر میں ہی پتنگ کٹوا کر ایسے واپس آ جاتے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ میں کیسا کیسا رو رو کر بؔوا سے شکایت کرتا تھا۔ وہ غریب بھی کیا کرتیں؟ کچھ غصہ سے اور کچھ پیار سے مشہؔود کو سمجھاتیں:

''بھیا! تو کیوں چھوٹے بھائی کو پریشان کرتا ہے؟ کیا ملتا ہے تجھے؟ مت لیا کر اس کی پتنگ۔'' پھر میرے ہاتھ پر چند پیسے رکھ کر کہتیں: ''جا، تو دوسری پتنگ لے آ۔''

مگر نہ تو مشہؔود اپنی حرکتوں سے باز آئے اور نہ ہی میں پتنگ اڑا سکا۔ اب مشہؔود بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں ماضی کی یادوں کی پتنگ تانے بیٹھا ہوں مگر آسمان میں کوئی اور پتنگ نظر نہیں آتی۔ الٰہی! یہ کیسی بیکسی ہے!

(۔۔۔۔۔ستنا۔۔۔۔۔)

گھر کا آنگن صرف آنگن ہی نہیں تھا بلکہ وہاں ایک طلسماتی دنیا آباد تھی۔ یہ آنگن ہماری معصوم زندگی کا محور تھا۔ اس کے ایک کونے میں ہماری بکری بندھی رہتی تھی۔ روزانہ صبح چرواہی سیکڑوں بکریوں کا ریوڑ لے کر گھر کے سامنے سے آواز لگاتی گذرتی: ''بکری کھول دووو!'' اور زنجیر کھلتے ہی بکری بھاگ کر ریوڑ میں گُم ہو جاتی۔ شام کو دن بھر جنگل میں چرنے کے بعد ممیاتا، خاک دھول کا طوفان اڑاتا یہ ریوڑ واپس آتا۔ ہر شام بابوؔجی بکری کا دودھ نکالتے اور ہر صبح ہم ملائی میں شکر ملا کر رات کی باسی روٹی سے کھاتے۔ ہر سال بکری بچہ دیتی۔ اس دن بابوؔجی اور بؔوا آنگن میں چارپائی کھڑی کر کے ہم بچوں سے بکری کا پردہ کر دیتے اور جب وہ فارغ ہو جاتی تو بؔوا ہمیں بلا کر بکری کا خوبصورت اور ننھا منا بچہ دکھاتیں۔ ایک مرتبہ بکری نے ایک بالکل سیاہ بچہ دیا تھا جس کا نام ہم نے کلؔور رکھا تھا۔ ایسا ہِل گیا تھا کہ آواز پر بھاگ کر پاس آتا تھا اور تیزی سے دُم ہلا ہلا کر ممیاتا تھا جیسے کہہ رہا ہو: ''لاؤ، کچھ کھلاؤ! کیوں بلایا ہے؟''

اسی آنگن کے ایک کونہ میں ایک ٹین کا ڈبہ داب کر گولک بنائی جاتی تھی۔ جب کہیں سے پیسہ دھیلا مل جاتا تو گولک کے سوراخ میں ڈال دیتا تھا۔ مگر مشہؔود کی موجودگی میں گولک کے پنپنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ تیسرے چوتھے وہ اسے کھود کر پیسے نکال لیتے اور خالی ڈبہ پھر گڑھے میں داب دیتے۔ بڑی لڑائیاں ہوتی تھیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ دوسری دنیا کو سدھار چکے ہیں۔ میری گولک میں ہزاروں امریکن ڈالر جمع ہو گئے ہیں مگر ان کو اب کوئی نہیں چراتا ہے اور میں ان کی بے قیمتی دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

کیا اب بھی گولک کے قریب بیر بہوٹیوں کی قبریں موجود ہیں؟ ہلکے جاڑے شروع ہوتے ہی میدان میں بیر بہوٹیاں نکل آتی تھیں، سُرخ اور مخمل کی طرح نرم نرم! گرمیوں کی راتوں میں یہی میدان جگنوؤں سے جگمگ جگمگ کرتا تھا۔ مٹھیوں میں بند جگنو انگلیوں کی جھریوں میں چراغ جلاتے بجھاتے رہتے اور مٹھّیاں کھلتے ہی اُڑ کر فضا میں گُم ہو جاتے تھے۔ بیر بہوٹیاں ماچس کی خالی ڈبیوں میں بند ایک آدھ دن میں مر جاتی تھیں اور ہم آنگن کے کونہ میں اداس ہاتھوں سے اخبار کے کاغذ کے کفن میں دفن کر دیتے تھے اور پھر نئی بیر بہوٹیوں کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ جگنوؤں اور بیر بہوٹیوں کی جگہ اب ملازمت، ڈالر اور سامانِ آرائش نے لے لی تھی مگر اِس نئے شوق سے دل کو وہ سکون اور مسرت نہیں مل سکی تھی جو بچپن کی معصوم زندگی کے جگنوؤں اور بیر بہوٹیوں کے ساتھ ماضی کی پہنائیوں میں بچھڑ گئی تھی۔

اور ہاں وہ کیاری تو میں بھولے ہی جا رہا تھا جس کو بؔوا نے آنگن کا ایک کونہ گھیر کر تیار کر رکھا تھا۔ انہیں پھولوں کا کس قدر شوق تھا! چند گل بانس، دو ایک سُرخ گلاب کے گملے، اِدھر گیندا، اُدھر بیلا اور ایک طرف لگی ہوئی چنبیلی! اس کیاری کی بس یہی کائنات تھی۔ جب گل بانس اور گلاب ساتھ ساتھ کھلتے تو کیاری میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ دوسری طرف بیلے کے پودوں میں ایسے بھر بھر کر پھول آتے کہ اُن کی کمر بوجھ سے دُہری ہو جاتی۔ ساری کیاری مہک اُٹھتی: ''اِدھر دیکھو! ایسے خوبصورت پھول کہیں اور بھی دیکھے ہیں تم نے؟'' سارا محلّہ خوشبو سے مہکتا تھا۔ اِدھر سے گلاب، بیلے اور چنبیلی کی مہک اٹھتی اور اُدھر چار نمبر مکان سے بنگالی بابو کی رات کی رانی کی مست کر دینے والی خوشبو کا بھبکا ہوا کے کاندھوں پر سوار آتا۔ جنت میں بھی ایسی خوشبو مشکل سے ملے گی۔ بؔوا روز بیلے کے موتی ایسے پھول توڑتیں۔ دو ایک پاندان کے اندر اور دو ایک دساوری پانوں کی ٹھلیا میں رکھ دیتیں۔ دن بھر پاندان خوشبو سے سرشار رہتا۔ سوئی سے تاگے میں پرو کر بیلے کا ہلکا سا گجرا گلے میں ڈال کر اور چھوٹے چھوٹے بیلے کے جھالے کانوں میں پہن کر جب وہ بیٹھتیں تو خدا کی قسم اس قدر معصوم اور خوبصورت دکھائی دیتیں کہ حوریں بھی شرماتی ہوں گی!

(۔۔۔۔۔کٹنی۔۔۔۔۔)

یہ ایک گھر کا قصہ نہیں ہے بلکہ ہر ٹوٹے ہوئے دل کی روداد ہے اور ہر اُجڑی ہوئی کائنات کا المیہ۔ وہ کمرہ جس میں بیٹھ کر مٹی کے تیل کی لالٹین کی مری مری روشنی میں رات گئے تک اسکول کا کام کرتے تھے، وہ ٹھنڈا غسل خانہ جس میں گرمیوں کی چھٹیوں میں دھوپ کی تپش سے گھبرا کر ہم رسالے پڑھنے اور تاش اور شطرنج کھیلنے کے لئے پناہ لیتے تھے اور وہ اندھا سا باورچی خانہ جس میں برسوں کی بیمار دکھیاری ماں چولھے کے سامنے بیٹھ کر بچوں کے لئے روٹی بناتی تھی، ہر گھر میں اور ہر زندگی میں موجود ہیں۔ یہ ضرور ہی کہ اوپری زیب و زینت اور خود اپنے دل کی آنکھوں سے پردے اٹھا کر دیکھنے کی توفیق چاہئے۔

مجھے اپنے گھر کا وہ باورچی خانہ بہت یاد آتا ہے، شاید اس لئے کہ بوؔا کا بیشتر وقت وہیں گذرتا تھا اور پیار اور محبت، ایثار و قربانی کے اکثر سوتے ماں کی پیاری ذات سے ہی نکلتے ہیں۔ اسی باورچی خانہ میں ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر بیٹھ کر ہم بوؔا کے ہاتھ کی گرما گرم، غبارہ کی طرح پھولی، کراری روٹی ارہر کی دال اور اچار سے کھاتے تھے۔ پیٹ بھر جاتا تھا لیکن نیت نہیں بھرتی تھی! اسی باورچی خانہ کے کونہ میں بیٹھ کر ہاون دستہ سے دھائیں دھائیں تِل اور گُڑ کوٹتا تھا اور بوؔا کی نگرانی میں لڈو بنا بنا کر مرتبانوں میں سجا دیا کرتا تھا۔ سارا گھر یہ لڈو مہینوں کھاتا تھا۔ یہیں ایک دیوار کے سہارے بوؔا پرانی سی جائے نماز بچھا کر، دوپٹہ کے بُکل میں چہرہ چھپائے، عاجزی سے سر جھکائے اپنے اللہ کو یاد کیا کرتی تھیں۔ نماز کے بعد دعا مانگ کر وہ اٹھتیں تو ان کے کمزور چہرہ پر فرشتوں ایسی سادگی اور آنکھوں میں ابدی سکوں کی چمک ہوتی تھی۔ اکثر مجھ سے کہتی تھیں:

''بھیا! معلوم نہیں میری دعا قبول بھی ہی گی کہ نہیں۔ پڑھتے پڑھتے بھول جاتی ہوں اور جانے کیا کیا پڑھ جاتی ہوں۔''

اور میں بڑے اعتماد سے جواب دیتا: ''بوؔا تم نماز پڑھتی رہو۔ اللہ میاں ضرور قبول کریں گے!''

وہ میری بچکانہ بات پر مسکرا کر محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ کسی بھی ماںؔ کی دعا قبول نہ ہونے کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ: ''ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے!'' اُس چھوٹی سی عمر میں بھی میں ماںؔ کے قدموں کی جنت سے خوب واقف تھا! رات کو جب سونے کے لئے کھٹولے پر لیٹتا تھا تو بوؔا دیوار کا سہارا لے کر میری پائنتی بیٹھ کر اپنا اک پیر میرے پہلو میں بڑھا دیتی تھیں۔ میں اسے سینہ سے لگا کر اپنا گال ان کے تلوے پر رکھ کر آنکھ بند کرتا تو آنا ''فانا'' ہی آنکھ لگ جاتی اور پھر صبح سے پہلے نہ کھلتی۔ معلوم نہیں اب وہ نیند کہاں اُڑ گئی ہے اور نیند کی گولیاں کھا کر بھی گھنٹوں کہاں غائب ہو جاتی ہے!

آج بھی ٹرین سے باہر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو آنکھوں میں نیند کا نام تک نہیں ہے اور چشمِ تصور ایسے میدان کو دیکھ رہی ہے جس میں بہت سے بچے ایک لکڑی کی گیند اور ڈنڈوں سے کھیل رہے ہیں۔ میں بھی ہاکی ہاتھ میں لئے گیند کے تعاقب میں اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہوں۔ میدان کی دوسری جانب، سڑک پار پریلؔ لائن کے مکان نظر آ رہے ہیں۔ اُدھر بائیں ہاتھ کہ مسجد کے سایہ میں کولاؔبا لائن اور سامنے مدراسؔ لائن ہے۔ ان میں میرے دوست رہتے ہیں: عبدالوحیدؔ، محمد احسنؔ خان، نریندرؔ کمار! وحیدؔ جو گول مٹول سا نولا سا تھا، بلا کا ذہین۔ کلاس میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ بچپن میں بھی ایسا خوش خط تھا کہ بابوجیؔ مجھ سے کہتے تھے: ''دیکھئے کتنا اچھا خط ہے۔ آپ کو بھی ایسا ہی لکھنا چاہئے۔'' مگر میں ہزار کوشش کے باوجود بھی ویسا نہیں لکھ سکا تھا۔

اور وہ احسنؔ! ظالم حساب میں کس قدر تیز تھا! ماسٹر صاحب تک اس کا لوہا مانتے تھے۔ کبھی کبھی مجھ پر ترس کھا کر اپنی نقل کر لینے دیتا تھا مگر اکثر ناک بھوں چڑھا کر جھڑک دیتا تھا۔ اب فرانسؔ میں گوری بیوی لئے بڑے عہدہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ پہلے نقل نہیں کرنے دیتا تھا اور اب میرے خط کا جواب نہیں دیتا ہے۔ بات تو ایک ہی ہے!

یادوں کے پوشیدہ دریچوں سے نکل نکل کر سب بچے مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں: ''کہاں رہے سرورؔ؟ آؤ بیٹا! ہوتی ہے شطرنج کی ایک بازی؟'' میں آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا ہوں اور ادھر نمبر ۷۔ فتح گڑھؔ لائن کے دروازہ سے لگی پریشان بوؔا مجھ کو آواز دے رہی ہے:

''ارے بھیا لوگ جائے گی۔ اب اندر آ جا۔ ٹھنڈا پانی پی لے۔ بس ہو گیا کھیل!''

اور میں کہہ رہا ہوں ''بس بوؔا ابھی آیا۔ بس دس منٹ اور!'' پھر یہ دس منٹ نصف صدی میں ڈھل جاتے ہیں۔ آنکھ مچولی، اندھا بھینسا، فٹ بال سب کب کے ختم ہو چکے ہیں اور میں تھکا ہارا میدان میں تنہا بیٹھا ہوا سوچ میں گُم ہوں۔

(۔۔۔۔۔سیہو را۔۔۔۔۔)

اب وطن بہت قریب آ گیا ہے۔ٹرین کے باہر پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے درختوں اور جھونپڑیوں کی طرح میں بھی پیچھے کی طرف دوڑ رہا ہوں جیسے گذرا ہوا وقت پھر واپس آ جائے گا اور میں وہی ہوں گا اور وہی سب لوگ! معلوم نہیں کہ محلّہ کی چھوٹی سی مسجد کا کیا حال ہوگا۔ بوڑھے، چھوٹی سی داڑھی والے موذن صاحب کی آواز میں کتنا درد تھا: اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشہدان لا الہ الا اللہ! اور دور دور سے نماز کے لئے آئے ہوئے محمودؔ و ایازؔ! آئے، نماز ادا کی، لوگوں سے علیک سلیک ہوئی، خیریت پوچھی اور رخصت ہوئے۔ نہ کوئی جھگڑا، نہ بحث! نہ کوئی سُنی تھا اور نہ کوئی شیعہ! عید، بقرعید پر نمازی اُبل کر مسجد سے باہر نکل آتے تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، ٹوپیاں لگائے بڑے شوق سے امام صاحب کا خطبہ سنتے جس کا ایک لفظ بھی کسی کے پلے نہیں پڑتا تھا۔

مسجد کے حوض میں کیا اب بھی وہ سرخ و سنہری مچھلیاں تیرتی اور غڑاپ، غڑاپ غوطے لگاتی ہوں گی جو ہر جمعہ کو حوض کے کنارے چمکدار آنکھیں اور لپ لپ کرتے ہوئے منھ لئے تیرا کرتی تھیں؟ ہم مٹھی بھر گندھا ہوا آٹا جمعہ کو مسجد لے جاتے تھے اور نماز کے بعد گولیاں بنا بنا کر مچھلیوں کے لئے پانی میں پھینکتے تھے۔ وہ اچھلتی کودتی آٹے کی گولیاں نگلنے کو جھپٹتی تھیں اور پانی میں سُرخ اور سنہری قوس قزح سی بن جاتی تھی۔ کبھی کبھی ہم آٹے کی گولی انگلی پر چپکا کر ہاتھ حوض میں لٹکا دیتے اور کوئی تیز طرار مچھلی قریب آ کر اس کو لے جاتی تھی۔ میں آج تک اپنی انگلی میں مچھلی کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتا ہوں۔

اور پھر بے اختیار مجھ کو وہ عید یاد آ گئی جب عین نماز کے درمیان مسجد کے باہر کے ایک خوانچہ والے نے تان لگائی تھی: ''رس بھری گنڈیری!'' اور ایک مکبر صاحب نے جواب میں ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کر دیا تھا! ساری کی ساری پچھلی صفیں رکوع میں چلی گئی تھیں اور نماز درہم برہم ہو گئی تھی۔ ہم بچوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا تھا۔ اُس دن نمازیوں نے گنڈیری والے سے زیادہ اُن مکبر صاحب کو لتاڑا تھا! مجھے تو ان کی معصوم غلطی پر آج بھی ہنسی آ رہی تھی۔ شاید پچاس سال سے میرے وجود میں قید بچہ وقت اور حالات کی قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا!

(۔۔۔۔جبل پور۔۔۔۔)

اسٹیشن پر میرا بچپن کا دوست دیوندرؔ ملتا ہے اور ایسے پیار سے لپٹ جاتا ہے کہ اس کے وقت سے پہلے سفید ہوئے بال ایک لمحہ کو میری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ میں جبل پورؔ کے در و دیوار کو ایسے دیکھ رہا ہوں کہ مجھ کو اس کی باتیں سنائی نہیں دیتی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ہم اس کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ برآمدہ میں ساری میں لپٹی ایک معصوم صورت خاتون ہاتھ جوڑے کھڑی ہیں۔ یہ رماؔ بھابھی ہیں۔ دوسری طرف سے ایک شرمیلی سی لڑکی بڑھ کر میرے پیر پکڑ لیتی ہے: ''انکل جی! سلام!'' یہ رماؔ بھابھی کی بیٹی آدِتی ہے۔

''بھائی صاحب! کچھ کھایئے نا۔ آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے ہیں۔ کوئی کشٹ ہو تو بتا دیجئے گا۔''

''انکل! پاپا کہہ رہے تھے کہ آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔ کھانا کھا کر کچھ سنایئے گا، ایں انکل؟''

دیکھتے دیکھتے دھرم، مذہب اور اجنبیت کے سب بندھن خلوص اور پریم کے ہاتھوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں اِس ہندو گھرانے کا ایک فرد بن جاتا ہوں جیسے میں وہاں ہمیشہ ہی رہا ہوں۔

دوسری صبح دیوندرؔ اپنی کار میں بٹھا کر مجھے میرے گھر کی طرف لے جاتا ہے۔ ہر شے اجنبی سی ہے مگر پھر بھی پچاس سال کی طویل مدت وہ سب کچھ نہیں مٹا سکی ہے جس سے میرا بچپن اور اُس کی یادیں وابستہ ہیں۔ میں عجیب بے چینی کی کیفیت میں مندر کے سامنے کار رکوا کر دیوندرؔ کو رخصت کرتا ہوں۔ وہ کچھ کہہ کر چلا جاتا ہے مگر میرے وجود نے سب کی طرف سے کان اور آنکھ بند کر لی ہیں۔ مجھے کچھ سنائی اور دکھائی دے رہا ہے!

مگر یہ مندر اتنا چھوٹا کیسے ہو گیا؟ پہلے تو بڑا عظیم الشان ہوا کرتا تھا۔ میں دروازہ کھول کر مندر میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اونچے چبوترے پر بھگوان کی مورتی کے قدموں میں ایک عورت پیلی ساری پہنے سر ڈھکے رامائن کا پاٹھ کر رہی ہے۔ وہ مجھے ایک نظر اٹھا کر دیکھتی ہے اور پھر پاٹھ میں مشغول ہو جاتی ہے۔ یا اللہ! میں اس مندر میں کیا کر رہا ہوں؟ اس عورت میں مجھ کو بواؔ کی جھلک کیوں نظر آ رہی ہے؟ یہ رام لیلا کا میدان میرے قدموں سے جیسے لپٹا کیوں جا رہا ہے؟ چند قدم اپنے گھر کی جانب بڑھاتا ہوں تو پتوں کے سرسرانے کی آواز آتی ہے: ''سرورؔ! تم کب آئے؟'' ارے! یہ تو وہی پیپل کا درخت ہے جس کے سایہ میں ہم گولی کھیلا کرتے تھے۔ اوپر نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو پیپل کی بوڑھی شاخوں میں اٹکی ہوئی پتنگ نظر آتی ہے۔ مانجھا لٹک کر ہوا میں لہرا رہا ہے:

''ہاں سرورؔ! یہ تمہاری ہی پتنگ ہے! میں نے سنبھال کر رکھ چھوڑی ہے۔ تم تو ایسے گئے کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں بھائی مگر میری پپلیاں اب

بھی میٹھی ہیں، چاہے کھا کر دیکھ لو۔ اب بھی انہیں طوطے کھانے آتے ہیں اور میری شاخوں میں فاختائیں اب بھی گھونسلے بناتی ہیں۔ کلو بکرے کے لئے کچھ پتے لیتے جاؤ!''

اور میں خاموش سنتا رہ جاتا ہوں۔ میرے کانپتے ہونٹ اور خشک گلا کچھ مجھے کچھ کہنے نہیں دیتے ہیں۔ میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں؟

ایک تھکی تھکی سی آواز اِس طلسم کو توڑ دیتی ہے: ''کون ہیں آپ؟ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں کیا؟''

میرے پاس پیلی پھولدار ساری کی کانے گھونگھٹ میں منھ چھپائے ایک عورت کھڑی ہے۔ مانگ سونی ہے اور سر کے بالوں میں عمر نے چاندی بھر دی ہے۔ میں ہکلا جاتا ہوں۔ اجنبی عورت سے دل کا حال کیسے کہہ سکتا ہوں؟

''میں تو کسی کو بھی نہیں ڈھونڈ رہا۔ پچاس سال پہلے سات نمبر کے مکان میں رہتا تھا۔ اسے دیکھنے چلا آیا ہوں۔ میرا نام سرورؔ ہے۔''

''ارے سرورؔ تم؟ مجھ کو نہیں پہچانتے؟ میں شکنتلاؔ ہوں، رام سروپؔ کی بہن!''

''شکنتلا! کیسی ہو تم؟ اچھی تو ہو؟ رام سروپؔ کہاں ہیں؟ افوہ کتنا وقت گذر گیا!'' میں ایک سانس میں کہہ جاتا ہوں۔

''بھیا کا تو دیہانت ہو گیا۔ تمہارے بہنوئی بھی نہیں رہے۔ اب میں بیٹے کے ساتھ پانچ نمبر میں رہتی ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔ ناشتہ پانی کر لو۔'' وہ بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

یہ وہی تو تھی جس کے ساتھ ہم دن بھر کھیلا کرتے تھے۔ بڑی جھگڑالو تھی۔ بات بات پر دھکا دے دیتی تھی۔ ''مچھر کہیں کا! جا نہیں کھیلتے تجھ سے۔ کل سے اِدھر نہیں آنا نہیں تو ماروں گی۔'' اور آج ناشتہ پانی کرانے لئے جا رہی ہے، بھیاؔ، بھیاؔ پکار رہی ہے اور بجھی بجھی راکھ کو کرید کر چنگاریوں سے کھیل رہی ہے۔

''بھیاؔ! اب پرانے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ کچھ اِدھر اُدھر چلے گئے اور کچھ بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ نو نمبر میں چندر کا پرساؔد اب بھی رہتا ہے۔ تمہارے گھر میں اب بشیرؔ بھائی رہتے ہیں۔ بڑے سجن پُرش ہیں۔ ملو گے تو کُھش ہو گے۔''

''اچھا! چندر کا پرساؔد یہیں ہے؟ ذرا اپنا گھر دیکھ آؤں تو جا کر اس سے ملوں گا، پھر تمہاری طرف آؤں گا۔ مگر شکنتلا! یہ مندر اتنا چھوٹا کیسے ہو گیا؟ اور یہ رام لیلا کا میدان تو بہت بڑا ہو کرتا تھا۔ یہ سڑک پہلے ہمارے گھر سے کتنی دور ہوا کرتی تھی۔ کیا دوبارہ بنی ہے؟'' میں گھبراہٹ میں بولے جا رہا تھا۔

شکنتلاؔ نے رحم بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ شاید اُسے میرے دلی کرب کا احساس تھا۔

''سرورؔ، مندر بھی وہی ہے اور میدان بھی وہی۔ اور یہ سڑک بھی پہلے جہاں تھی وہیں پر ہے۔ ہاں، مگر تم جرور بوڑھے ہو گئے ہو۔ بہت سمے گجر گیا بھیاؔ! جاؤ گھر دیکھ آؤ، پھر میرے یہاں آ کر چائے پی لینا۔''

ہاں شکنتلاؔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سرزمین نہیں بدلی ہے، میں ہی بدل گیا ہوں۔ یہ بوڑھا پیپل کا پیڑ، اس کی شاخوں میں الجھی ہوئی پتنگ، طوطوں کے شور مچاتے ہوئے ہرے ہرے جھنڈ، فاختاؤں کے گھونسلے، تمہارا پیار، کوئی چیز بھی تو نہیں بدلی ہے، بس میں ہی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو شکنتلاؔ! اکیلے جاتے ہوئے دل کانپ رہا ہے۔ معلوم نہیں وہاں کون کون اندر چھپا بیٹھا ہو گا۔ مجھے واپس باہر نکلنے بھی دے گا کہ نہیں۔

اب میں اپنے بچپن کے گھر کے دروازہ پر کھڑا ہوں۔ یہاں میں پیدا ہوا تھا۔ مگر یہ دروازہ اتنا چھوٹا کیسے ہو گیا؟ دستک دیتا ہوں تو ایک بارہ تیرہ سال کی بھولی سی لڑکی دروازہ کھولتی ہے اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔

''بیٹی، تمہارا نام کیا ہے؟'' میں سوکھے گلے سے پوچھتا ہوں۔

''جی، ریحانہؔ!'' وہ حیرت سے جواب دیتی ہے۔ ''آپ کون ہیں؟''

''بیٹی، میں اس گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے ابا اور امّی سے پوچھ لو، اگر وہ اجازت دیں تو میں اپنا پرانا گھر اندر سے دیکھ لوں۔''

وہ میرے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی ہے: ''ابا تو کام پر گئے ہیں اور امّی بازار۔ آپ اندر آ کر گھر دیکھ لیجئے۔'' وہ یوں اپنائیت سے جواب دیتی ہے جیسے مجھ کو ہمیشہ سے جانتی ہے۔ میں سارے بدن سے کانپتا ہوا گھر کے آنگن میں داخل ہوتا ہوں اور نظریں اٹھا کر برآمدہ کی طرف دیکھتا ہوں۔

ارے! یہ کیا؟ سامنے دائیں جانب برآمدہ میں بچھے کھٹولے پر موٹے لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہنے اور موٹی ململ کا ہلکے گلابی رنگ کا دوپٹہ سر پر ڈالے بواؔ مسکرا رہی ہیں۔ اُن کی غم دیدہ آنکھوں میں خوشی اور فخر کی عجیب سی چمک ہے:

''آؤ بھیا آؤ! بہت دیر کر دی تم نے آنے میں! کہاں رہ گئے تھے؟ میں تو کب سے بیٹھی راہ دیکھ رہی ہوں تمھاری۔ اچھے تو ہو بیٹا؟'' میرے کانوں میں ان کی جانی پہچانی

مامتا سے لبریز آواز امرت گھول رہی ہے۔

''بواؔ! نہیں، نہیں، میں بھلا تم کو بھول کیسے سکتا ہوں! کوئی ماںؔ کو بھول سکتا ہے؟ ذرا یہ کمبخت آنسو بند ہوں تو میں تمھیں غور سے دیکھوں۔ یہ گلے کی گھٹن کم ہو تو کچھ بولوں۔ یہ صدیوں کے درد سے بوجھل ہاتھ اٹھ سکیں تو میں تمہیں سینہ سے لگاؤں، میں کتنا ظالم ہوں کہ تمہیں اتنا انتظار کرایا۔ تم ناراض تو نہیں ہو؟

''ناراض؟ پاگل ہوا ہے کیا؟ آ، یہاں بیٹھ میرے پاس۔ تو تھک گیا ہوگا۔'' وہ مسکرا کر کہتی ہیں۔

میں آنکھوں سے آنسو پوچھ کر نظریں اٹھاتا ہوں تو برآمدہ سے اٹھ کر شاید بواؔ اندر چلی گئی ہیں۔ کھٹولے کی جگہ دو گرد آلود کرسیاں پڑی ہیں اور ریحانہؔ میرے پاس پانی سے بھرا گلاس لئے کھڑی ہے۔

''بیٹھ جایئے انکل! ذرا سا پانی پی لیجئے۔'' اس کی آواز میں بلا کا درد ہے، شاید وہ میرا کرب سمجھتی ہے۔ میں اپنی دھندلائی ہوئی آنکھیں اٹھا کر انتہائی بے بسی سے اس گھر کو دیکھتا ہیں جو معلوم نہیں کیسے سکڑ کر گُڑیا کے گھر کی طرح مختصر ہو کر رہ گیا ہے۔ کیا شکنتلاؔ سچ کہتی تھی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طلسماتی گھر میں دوبارہ رہنے کے لئے مجھ کو پھر سے جنم لینا ہوگا؟ یا پھر دل کی وہ آنکھیں کھولنی ہوں گی جو بڑھتی عمر، زندگی کی بے پناہ یورش اور دنیا کی فکر اور تقاضوں نے جانے کب سے بند کر رکھی تھیں؟ یہ گھر آج وہی ننھا سرورؔ مانگ رہا تھا جسے اُس کی پیاری ربوؔ آپا اپنی بانہوں میں جُھلا جُھلا کر دھیمی اور میٹھی آواز میں گاتی تھیں:

چھوٹا سا بلما مورا آنگنا میں گلی کھیلے
ماروں گی پنکھیوں کی مار وہ تو ہنس کر ڈولے!

میں سر جھکائے بیٹھا ہوں کہ ریحانہؔ کی آواز میرے خوابوں کا طلسم توڑ دیتی ہے:

''آیئے انکلؔ اندر سے گھر دیکھ لیجئے۔''

میں لمبا سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور حیرت سے خود کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ میرا چھ فٹ کا قد سُکڑ کر ننھا سا ہو گیا ہے اور وہ مختصر سا آنگن پھیل کر پھر سے ایک لق و دق میدان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں گلابی لُگدی سے رنگے ہاتھ لئے حیرت و مسرت کے عالم میں سارے گھر کا چکر لگا رہا ہوں، برآمدہ سے کمرہ میں، کمرہ سے باورچی خانہ میں، اِدھر سے اُدھر! اور میرے بچپن کا طلسماتی گھر اپنے پرانے خزانے کھول کھول کر میرے سامنے بکھیر رہا ہے! کہیں بھی تو کچھ نہیں بدلا ہے! ہر چیز اپنی جگہ پر جیسی کی تیسی ہے۔ اِدھر بابوجیؔ چارپائی پر لیٹے اخبار پڑھ رہے ہیں اور اُن کے حقہ کی گڑگڑاہٹ گھر میں گونج رہی ہے۔ یہ بواؔ کا پاندان ہے جو تازہ گلاب کے پھولوں سے مہک رہا ہے۔ اِکمرہ میں مشہودؔ لالٹین کی مری مری روشنی میں اسکول کی کتاب میں چُھپا کر ناول پڑھ رہے ہیں۔ باورچی خانہ سے تازہ تازہ گرم گرم روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی ہے اور میں ٹاٹ کے ٹکڑے پر بیٹھا منھ میں آیا پانی نگل کر بواؔ سے کہہ رہا ہوں:

''بواؔ ذرا روٹی کراری سینک دینا، اچھا؟''

اُدھر کونے میں ہماری بلی دودھ پینے کے بعد اپنے پنجے سے چاٹ چاٹ کر منھ دھو رہی ہے۔ میں کمرہ سے نکل کر برآمدہ میں آتا ہوں تو آنگن سے مُرغیوں کے کڑکڑانے کی آواز میری توجہ کھینچ لیتی ہے۔ دور کونہ میں کلوؔ اپنی ماں کے نیچے کھڑا ممیا ممیا کر، زور زور سے دُم ہلاتا ہُوا دودھ پی رہا ہے اور گولک والے کونے سے بیر بہوٹیوں کی قطار ایک سُرخ ریشم کی لکیر کھینچتی ہوئی پھولوں کی کیاری کی جانب جا رہی ہے!

میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو میرا سارا وجود ایک عجیب سرشاری سے لبریز ہے۔ دل میں درد اب بھی ہے مگر اس درد میں ایک انوکھی لذت ہے! آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں ٹھنڈک ہے اور روح کا سارا کرب ایک سرخوشی کی کیفیت میں ڈھل گیا ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آ چکا ہے!

میں واپسی کے لئے جب قدم اٹھاتا ہوں تو ڈھلتے سورج نے شام کی دلہن کے سر پر لال، پیلی، عنابی ڈوروں سے بنی ہوئی اوڑھنی ڈال دی ہے۔ دور مسجد کے میناروں سے پرے یادوں کے کتنے ہی مینار دست بدعا کھڑے ہوئے ہیں۔

آخری بار پلٹ کر جب میں نے اپنے گھر کو دیکھا تو وہ روپہلی کرنوں سے جگمگا رہا تھا اور دروازے کی آڑ سے بواؔ سر پر ہلکے گلابی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے مسکراتے ہوئے جھانک رہی تھیں: ''بھیا! پھر جلدی آنا۔ میں تیرا انتظار کروں گی!''

''''''

قصۂ چہار درویش

بچپن میں بزرگوں سے یہ مشہور مثل سن رکھی تھی اور پھر ذرا بڑا ہو کر کتابوں میں بھی پڑھی کہ ''جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔'' بزرگوں نے سنائی تھی چنانچہ یہ مثل صحیح ہی ہوگی۔ کبھی اس کے مشاہدہ کا موقع نہیں ملا۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ بات اُس زمانے میں صحیح ہُوا کرتی ہوگی۔ گیدڑ بھی نرے عقل سے کورے ہی ہوتے ہوں گے اور شہر بھی نسبتاً ''چھوٹے اور نیم آباد! آج کل کے شہروں میں جیسی بے شمار آبادی ہے اور سڑکوں پر موٹر، بسوں اور لوگوں کا جو شور شرابا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے بھلا کون سا ایسا گیدڑ ہوگا جو ایک تو شہر کے قریب کہیں مقیم ہوگا اور دوسرے صرف تفریح کی خاطر یا کسی دوسرے ہم مذاق گیدڑ کی تلاش میں شہر میں داخل ہونے کی حماقت کرے گا؟

خیر! یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو قصہ گوئی کی دُھن میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا! دراصل میں صرف اس قدر کہنا چاہتا تھا کہ میری شامت جو آئی تو اُس دن مختارؔ بیڑی کو چوتھی کلاس کی اردو کی کتاب میں پڑھا ہوا قصہ چہارؔ درویش سنانے بیٹھ گیا اور وہ بھی ایسے وقت جب وہ تاش کی بازی میں بڑی بے دردی کے ساتھ تین اناڑی جواریوں کی جیب خالی کر رہا تھا۔ میری شامت دو صورتوں سے یقینی تھی۔ ایک تو قصہ چہارؔ درویش مجھ کو بالکل یاد نہیں تھا اور جو ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ذہن اور یادداشت کے خاک آلود طاقوں میں پڑے ہوئے تھے ان کو از سرِ نو یاد کر کے مناسب ملمع سازی بلکہ جعل سازی کے بعد بیان کرنے کی کوشش میری حماقت اور ناعاقبت اندیشی ثابت کرنے کے لئے بہت کافی تھی۔ دوسرے یہ کہ میں قصہ چہارؔ درویش ایک ایسے شخص کو سنانے کی فکر میں تھا جو ماضی ءقریب و بعید میں اس قسم کے قصوں سے اپنی مکمل بیزاری کا اعلان و اظہار نہایت مرصع اور ٹکسالی گالیوں سے کئی مرتبہ کر چکا تھا اور ادب و شعر اور اخلاقیات سے جس کی ناواقفیت کی ایک دنیا معترف تھی! مگر وہ جو میں نے شروع میں عرض کیا تھا نہ کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو۔۔۔!

میرا خیال تھا کہ قصہ چہارؔ درویش کسی طرح اُن چار درویشوں پر ڈھال لوں گا جو اس وقت میری حجرہ نما بیٹھک میں تخت پر بڑے اہتمام سے تاش کی بازی میں مصروف تھے اور جن میں سے تین درویش اسی قدر دریا دلی سے اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی چوتھے درویش کی جیب میں منتقل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو یقیناً ''درویش صورت تھا۔ خلیل خاںؔ جب سے مختارؔ بیڑی کے قول کے مطابق ''ٹناٹن مسلمان'' بن کر تبلیغی جماعت کا ممبر ہو گیا تھا اُس نے گیروے کپڑوں، اونچی دیوار کی گول ٹوپی، لہراتی ہوئی ڈاڑھی اور کالے منکوں کی تسبیح سے لیس ہو کر خاصہ درویشانہ حلیہ بنا لیا تھا۔ تاش وہ اب بھی ہمارے ساتھ باقاعدگی سے کھیلتا تھا لیکن کہتا تھا کہ:

''برسوں کا ساتھ ہے، مجبوری کو کھیل لیتا ہوں ورنہ اب کوئی شوق تھوڑی رہ گیا ہے!''

اور مختارؔ بیڑی مسکرا کر اس کے روپے داخلِ دفتر کر لیتا۔ باقی تین یعنی میں، سید ناظمؔ حسین اور مختارؔ بیڑی کسی طرح درویش کہلانے کے قابل نہیں تھے۔ اب سوچتا ہوں ہو حیرت ہوتی ہے کہ میں مختارؔ بیڑی کو قصہ چہارؔ درویش سنانے بیٹھا تھا؟ لیجئے پھر بہک گیا! کہنا کچھ چاہتا ہوں اور اپنی رَو میں کہہ کچھ اور جاتا ہوں۔

خیر تو یوں ہوا کہ مختارؔ بیڑی کچھ دیر تو اپنی چندھی آنکھیں مچمچا کر قصہ چہارؔ درویش سنتا رہا اور چاند مارکہ بیڑی کا دھواں خلیل خاںؔ کی طرف منھ بھر بھر کر پھینکتا رہا۔ پھر اچانک بیڑی گلی میں پھینک کر بولا: ''ابے یہ کیا چہار چہار لگا رکھی ہے؟ چار کیوں نہیں کہتا؟ آیا سالا وہاں سے فارسی پڑھانے! اور پھر اس قصہ کی اس وقت کون سی تُک ہے؟''

ابھی میں اس حملہ کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ خلیل خاںؔ نے خالص پہشہ ورانہ انداز میں تاش کی گڈی قینچی لگاتے ہوئے کہا: ''بھائی مختارؔ یہ تم ہر وقت گالی دے کر کیوں بات کرتے ہو؟ اللہ رسول ﷺ کی بات تو الگ رہی تم تو بالکل ہی بے لگام ہو کر رہ گئے ہو۔ میاں! کسی وقت تو سیدھی بات کر لیا کرو!'' وہ بڑے تبلیغی موڈ میں معلوم ہو رہے تھے۔

سید ناظمؔ حسین یہ ساری کارروائی اپنا آدھا گنجا سر سہلا سہلا کر غور سے سن رہے تھے۔ خلیلؔ خاں کی تقریر سُن کر بولے: ''یار یہ مختارؔ نیک کام کرتا تو ہے مگر سب سے چھپ کر کرتا ہے۔'' یہ سن کر مختارؔ بیڑی کا پارہ ایک دم اوپر چڑھ گیا۔ ''ابے! میں کسی سے ڈرتا ہوں جو چھپ چھپ کر کام کروں گا سالے! تو نے کب دیکھا ہے مجھ کو دنیا سے چھپتے ہوئے؟''

کاظمؔ نے مسکرا کر جواب دیا: ''وہ تم پرسوں نہر یا پار والے بدھوؔا کمہار کو ماں بہن کی سڑی سڑی گالیاں جو دے رہے تھے وہ کیا تھا؟''

خلیلؔ خاں کا ہاتھ پتے بانٹتے بانٹتے رک گیا۔ حیرت سے بولے: ''سیدؔ صاحب! یہ ماں بہن کی سڑی سڑی گالیاں کب سے نیکی میں گنی جانے لگی ہیں؟''

کاظمؔ حسین نے بھنا کر جواب دیا: ''اماں! تم پوری بات تو سنتے نہیں ہو اور بیچ میں اپنی تبلیغی ٹانگ اڑا دیتے ہو۔ اس نے بدھوؔا کمہار کو صرف گالیاں ہی نہیں دی تھیں بلکہ دو چار دھپ بھی رسید کر دئے تھے!''

اب بات خلیلؔ خاں کی سمجھ سے بالکل ہی باہر ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے منھ کھولے کاظمؔ کا منھ تک رہا تھا۔ مختارؔ بیڑی بھی کچھ جھینپ سا گیا تھا۔ یہ میں بہت ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا ہوں کیونکہ مختارؔ کا تصور جھینپ کے ساتھ ذرا مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے! میں نے سوالیہ نظروں سے کاظمؔ کو دیکھا تو وہ بولا:

''یار ہُوا یوں کہ کلثومؔ بھابھی نے بتایا کہ مختارؔ پرسوں دوپہر نہر یا پار گیا ہوا تھا تو سڑک پر ایک گدھا نظر آیا جس کے اگلے دونوں ٹخنے اس کے مالک نے مونجھ کی رسی سے باندھ دئے تھے کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ سب کمہار کمبخت یہی کرتے ہیں۔ وہ گدھا بڑی مشکل اور تکلیف سے اگلی ٹانگیں اچھال اچھال کر چل رہا تھا اور سڑک کے کنارے کی سوکھی گھاس چر رہا تھا۔ مختارؔ نے جھٹ جیب سے چاقو نکال کر گدھے کی رسی کاٹ دی۔ زخم جانے کتنے پرانے تھے کہ بائیں ٹخنے میں کیڑے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ کسی طرح یہ گدھا گھر لے آیا۔ میں جب اُدھر گیا ہوں تو اس نے ایک ٹین کے ڈبہ میں فنائل گھول کر گدھے کے اگلے پیر اس میں ڈبو رکھے تھے اور خود کلثومؔ بھابھی کے ہاتھ کی روٹی اپنے ہاتھ سے گدھے کو کھلا رہا تھا۔''

میں نے مختارؔ کی جانب دیکھا تو وہ بیڑی سلگانے کے بہانے ہاتھوں کے پیالے میں اپنا منھ چھپائے ہوئے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میری نظروں نے دھوکا کھایا ہو مگر میرا خیال ہے کہ اس کی چندھی آنکھوں میں نمی سی چمک رہی تھی۔ خلیلؔ خاں نے تاش کے پتے تخت پر الٹے رکھ کر چائے کی پیالی کا گھونٹ بھر کر کہا: ''اماں چھوڑو بھی! یہ تو دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ تم کوئی خدائی فوجدار ہو کیا؟ کہاں تک ہر گدھے کو ہانک کر گھر لاتے رہو گے؟ لاحول ولاقوۃ!''

مختارؔ بیڑی جیسے بھنا ہی تو گیا: ''ابے سب گدھوں کو تو نہیں بچا سکتا تو کیا ایک کو بھی نہ بچاؤں؟ تو بھی تو سنت کے بارے میں کہا کرتا ہے کہ سب سنتیں پوری نہیں کر سکتا ہوں تو کیا ایک بھی نہ کروں؟ وہ سالا بدھوؔا کمہار شام کو گدھا ڈھونڈتا ہوا میرے گھر آیا تو میرا غصہ کچھ کم ہو گیا تھا ورنہ حرامی کو بہت مارتا۔ یہ کمینے بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہیں، پھر کھانے کو نہیں دیتے اور اوپر سے داب کر کام لیتے ہیں۔ مردود کہیں کے!''

کاظمؔ حسینؔ ہنس کر بولے: ''مگر یار! تم نے جو بدھوؔا کو دھپیا دیا تھا تو وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گیا، آج صبح میں اُدھر دودھ لینے گیا نا تو وہ پچکار پچکار کر گدھے کو گھاس کھلا رہا تھا!''

شاید ابھی بات اور آگے بڑھتی کہ مختارؔ کا بیٹا بیٹھک میں داخل ہُوا اور بولا: ''ابو! چلئے امی بلا رہی ہیں۔ ہاتھرسؔ سے قدوسؔ ماموں آئے ہیں۔''

مختارؔ بیڑی نے تخت سے روپے سمیٹ کر جیب میں ڈالے اور بے دلی سے اٹھتا ہوا بولا: ''دھت تیری کی! پھر آ گئے سالے صاحب! ان سے کوئی پوچھے کہ ایسی کیا جلدی تھی؟ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو دو دن یہاں رہ کر گئے ہیں!'' پھر وہ جوتا پہن کر جھومتا ہوا بیٹھک سے نکل گیا۔

ہم لوگ اس واقعہ کے بعد کچھ دنوں مختارؔ کو چھیڑتے رہے۔ سڑک پر کوئی گدھا نظر آ جاتا تو کاظمؔ اس سے کہتا: ''دیکھو، دیکھو وہ تمہارا بھائی جا رہا ہے۔ کس قدر صورت مل رہی ہے!'' خلیلؔ خاں اس کے سامنے گھاس کا گچھا رکھ کر کہتا: ''تمہاری بھابھی بدھنؔ کمہارن نے کہلایا ہے کہ وہ گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے تمہیں یاد کرتا ہے۔ سنیچر کو آ کر گھاس کھا جاؤ، تازی منگائی ہے!'' مختارؔ بیڑی ان بچکانہ باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا: ''سالوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ گدھا ہی تم:۔۔۔۔ سے: زیادہ سمجھدار ہے۔ لا منگا کڑک چائے سالے! تیری باتوں سے منھ کا مزا خراب ہو گیا!''

کوئی دو ہفتوں بعد میں اور مختارؔ دن ڈھلے چہل قدمی کرتے کرتے گوشت والی گلی سے گذر رہے تھے کہ نکڑ پر ممّوؔ کی کرانے کی دوکان پر چاند مارکہ بیڑی لینے کو رک گئے۔ ممّوؔ کا نام تو شاید کچھ اور تھا لیکن مشہور وہ اسی نام سے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا نام محمد میاںؔ ہو یا پھر اس کی عادت کی مناسبت سے لوگ اسے ممّوؔ کہنے لگے ہوں۔ وہ ہر وقت دوکانداری میں نقصان، بیوی بچوں کی بیجا خرچ کرنے کی عادت یا دوسرے دوکانداروں کی بے ایمانی کی شکایت ڈنڈی مار کر تولتے ہوئے ممیا ممیا کر کیا کرتا تھا۔ آج وہ دوکان کے تختہ پر بیٹھا سڑک کی جانب جھکا گالیاں دے رہا تھا جہاں میلے کچیلے کپڑے پہنے ایک سات آٹھ سال کی بچی نالی کے گندے پانی میں ہاتھ ڈالے بیٹھی تھی اور پاس ہی ایک چار پانچ سال کا بچہ صرف پھٹی قمیص پہنے کھڑا ہوا سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا: ''ارے بھاگ یہاں سے لونڈیا! کیا پانی میں سڑ پٹر کر رہی ہے؟ ابھی لگاؤں گا دہ ہاتھ سالی کو!۔۔۔ آؤ باؤ جی آؤ۔ ذرا بچ کر! نالی کے پانی سے بچ کر باؤ جی!۔۔۔۔ اری او لونڈیا! سنتی ہے کہ نہیں؟۔۔''

مختؔار بیڑی نے اس لڑکی کو دیکھا جو آنسو بھری آنکھوں سے مؔمو کو دیکھ رہی تھی۔لڑکا اب قمیص کے پلو سے بہتی ہوئی ناک پوچھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔مختؔار نے ہاتھ کے اشارہ سے مؔمو کو خاموش کرتے ہوئے اس بچی سے پوچھا:''ارے کیا ڈھونڈ رہی ہے نالی میں؟ کیا گر گیا ہے تیرا؟''

بچی نے گندے پانی سے ہاتھ نکال کر بے بسی سے مختؔار کو دیکھا اور روہانسی ہو کر بولی:''اماں نے پانچ روپے دال چاول لانے کو دئے تھے۔بھؔیا کے ہاتھ سے نالی میں گر گئے۔گھر جائیں گے تو ابا بہت مارے گا:'' وہ بے اختیار رو پڑی۔لڑکے کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔مؔمو نے بیڑی کا بنڈل مختؔار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:''ارے باؤ جی! کس چکر میں پڑے ہو؟ جبز جستی لونڈیا بک بک کر رہی ہے۔یہ تو سالا روج کا کسہ ہے۔۔۔اری او لونڈیا اب بھاگ جا یہاں سے بھلا؟''

مختؔار نے اس کو خونخوار آنکھوں سے دیکھا تو اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔مختؔار نے بچی کو اشارا کیا:''ادھر آ تو! نہیں مارے گا ابا، تو چپ ہو جا۔'' پھر مُڑ کر مؔمو سے بولا:

''ذرا پانچ پانچ کلو مونگ اور ارہر کی دال باندھ دو اور دو کلو چاول بھی دے دو۔پیسے میرے حساب میں لکھ لینا۔اور ہاں مٹھائی کی گولیوں کے دو پیکٹ بھی دے دو۔''

اس وقت اس کی آنکھوں میں بلا کی اداسی تھی۔ہر وقت گالیاں دینے والا مختؔار غریب بچی کے سر پر ہاتھ رکھے زمین کو گھورے جا رہا تھا۔مؔمو نے حیرت سے اس کو دیکھا اور خاموشی سے سامان کا تھیلا مختؔار کے ہاتھ میں تھما دیا۔مٹھائی کی گولیوں کے پیکٹ دونوں بچوں کے ہاتھوں میں تھما کر اس نے کہا:''چل میرے ساتھ۔کہاں ہے تیرا گھر؟''

بچی نے اُنگلی سے نور منزؔل کی جانب اشارہ کیا اور دونوں بچے حیرت اور خوشی سے تقریباً'' اچھلتے کودتے اُدھر کو چل دئے۔نور منزؔل کی مسجد کی دیوار تلے چھپر پڑی ایک خستہ سی جھونپڑی کے سامنے رُک کر بچے زور زور سے چلانے لگے:''اماں، اے اماں! جلدی سے آ۔دیکھ باؤ جی آئے ہیں۔''

جھونپڑی سے ایک کمزور سی عورت سر پر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی نکلی۔اس کے ننگے پیر جگہ جگہ سے پھٹ رہے تھے اور ہاتھ کی لکیریں خاک اور راکھ سے اس کی تقدیر کی طرح سیاہ تھیں۔پیچھے پیچھے ایک سوکھا کمزور مرد پھٹا تہمد باندھے آدھے بدن سے ننگا نکل کر آیا۔دونوں ہمیں دیکھ کر گھبرا گئے۔انہوں نے جھونپڑی پر کسی سفید پوش کو آتے ہوئے کب دیکھا ہوگا! عورت ڈرتی ڈرتی بولی:''جی ساب! ان دونوں نیک کچھ کیا ہوگا؟ بڑے بدماس ہیں یہ دونوں باؤ جی۔کیوں ری مریؔم کیا سرارت کی تو نے؟''اس نے مارنے کو ہاتھ اٹھایا تو بچی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

مختؔار بیڑی نے بچی کو اپنے پیچھے کرتے ہوئے کہا:''ارے ٹھیر ذرا! بچوں نے کچھ نہیں کیا ہے۔دیکھ، لڑکے کے ہاتھ سے تیرے دئے ہوئے پانچ روپے کہیں کھو گئے ہیں مگر اسے تو مارنا نہیں بھلا؟ لے یہ تھیلا۔اس میں دال چاول ہیں، میں لیتا آیا ہوں۔اور لے یہ کچھ روپے بھی رکھ لے۔بچوں کے کام آئیں گے۔''

اس نے پچاس روپے کا ایک نوٹ عورت کے لرزتے ہوئے ہاتھ میں تھما دیا۔بچوں کا باپ اب زمین پر اُکڑوں بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔مختؔار بیڑی نے پلٹ کر ایک جھٹکے سے اپنے بدن سے قمیص اتار کر اس مرد کے ننگے کندھوں پر ڈال دی اور خود بنیان پہنے پہنے گھر کی جانب لوٹ پڑا۔میں اس کے ساتھ پلٹا تو مختؔار کی چندھی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔اُدھر مسجد سے موذن کی خوبصورت آواز ہوا کے کاندھوں پر سوار لہرا رہی تھی:''حی علی الصلات! حی علی الفلاح!''اور سڑک پر کئی نمازی سروں پر ٹوپیاں سنبھالتے ہوئے مسجد کی جانب تیز تیز قدموں سے جا رہے تھے۔

زادِراہ

آج منشی خوشی محمد کے چچا حاجی تفضّل حسین مرحوم کا چالیسواں تھا۔ حاجی صاحب مرحوم نے تقریباً'' اسی سال کی عمر پائی تھی۔ متقی، پرہیزگار، صوم وصلوۃ کے پابند بڑے پیارے بزرگ تھے۔ ان کی نیکی اور خدا ترسی کا چرچا دور دور تک تھا اور لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کیا چھوٹے کیا بڑے ہر ایک کا ''دادا میاں، دادا میاں!'' کہتے ہوئے منھ سوکھتا تھا۔ اس عمر میں وہ اوروں کے لئے کچھ کر تو نہیں سکتے تھے لیکن سب سے ہنس کر ملتے اور منھ بھر بھر کر دعائیں دیتے تھے۔ اُن کے جنازے پر شہر کا شہر ٹوٹ پڑا تھا اور جریب کی چوکی سے لے کر روٹی والی گلی تک سے سوگوار لوگ شرکت کے لئے آئے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس سے پہلے ایسا شاندار جنازہ کسی اور کا نہیں اٹھا تھا۔

حاجی صاحب مرحوم کی اپنی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اور تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی تھیں۔ وہ منشی جی کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے اور منشی جی بھی چچا جان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مدت ہوئی ضد کر کے حاجی صاحب اور چچی کو اپنے ساتھ رہنے کے لئے لے آئے تھے کہ بڑھاپے میں تنہا چھوڑنا ان کو منظور نہیں تھا۔ مختار بیڑی جو منشی جی سے اللہ واسطے کا بیر رکھتا تھا ان کی اس سعادتمندی پر گالیوں کے درمیان اپنے اطمینان کا اظہار کر دیا کرتا تھا: ''منشی جی نے ساری عمر چار سو بیسی کی مگر ایک یہی کام سالا انہوں نے اچھا کیا۔''

حاجی تفضّل حسین مرحوم منشی جی کی کچہری کی ملازمت سے کچھ خوش نہیں تھے۔ عموماً'' کچھ بھتیجے کی محبت میں اور کچھ مصلحت کے پیش نظر خاموش دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے مگر کبھی کبھی دبی زبان سے ٹوک بھی دیتے: ''بیٹا کیوں ایسی بدذات نوکری جان کو لگا رکھی ہے ؟ نہ اللہ خوش اور نہ ہی دنیا والے۔ چھوڑ دو اس کو۔ اللہ بڑا رازق ہے، کہیں بہتر نوکری دلوا دے گا۔ اور کچھ نہیں تو کوئی چھوٹی موٹی دوکان ہی کر لینا۔ کمائی تو حلال کی ہو جائے گی۔''

منشی جی سر جھکائے، آنکھیں چرائے ''ہوں، ہاں'' کر کے ادھر اُدھر کھسک جاتے۔ وہ بھی آخر کیا کرتے۔ ایک تو اچھی تنخواہ کی نوکریاں کوئی بازار میں تھوڑی بک رہی تھیں کہ گئے اور خرید لائے۔ کیسے کیسے بی اے، ایم اے خالی خولی مارے مارے پھر رہے تھے۔ بس کنڈکٹری تک کے لئے بھی بڑی سفارش اور بھر پیٹ رشوت چاہئے تھی۔ پھر کچہری کی نوکری ایسی کیا بری تھی؟ اللہ نے یہ ملازمت دلوائی تھی تو اس کو چھوڑ کر کفران نعمت کے گنہگار کیوں ہوتے۔ اب دیکھئے کہ وہ ہر صبح ''توکلت علی اللہ'' کہہ کر گھر سے نکلتے تھے اور شام کو اللہ کے فضل وکرم سے جیب بھر لاتے تھے۔ آخر ان کو آٹھ افراد کا گھر بھی تو چلانا تھا۔ برادری میں اپنی ساکھ قائم رکھنی تھی۔ بیٹیوں کی شادیاں کرنے کو پڑی تھیں۔ ٹھیک ہے، تھوڑی سی ہیرا پھیری کرنی ہوتی تھی، سو وہ کون سی نوکری یا کس دوکانداری میں نہیں کرنی پڑتی تھی؟ جس اللہ نے کچہری کی نوکری دلوائی تھی وہی معاف بھی کر دے گا۔ انشااللہ!

ویسے منشی جی کے دل میں حاجی صاحب مرحوم کی باتوں سے ایک چور سا بیٹھ گیا تھا۔ شاید اُسی نے اُن کو چالیسویں کی فاتحہ کا زبردست انتظام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے سے ان کا بیٹا ولی محمد دور دور تک دعوت نامہ لے کر گیا تھا: ''اگلی سنیچر کو ہمارے گھر دادا جان کی چالیسویں کی فاتحہ ہے۔ عصر کی نماز کے بعد قرآن خوانی ہے، پھر فاتحہ ہوگی۔ مغرب کی نماز چوراہہ کی مسجد میں ہے اور پھر کھانا۔ ابا جی نے بہت بہت کہا ہے کہ ضرور آویں۔''

ولی محمد جب خلیل خاں کی بزازے کی دوکان پر دعوت دینے آیا تھا تو میں اور مختار بیڑی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ ولی محمد کی رٹی رٹائی تقریر مختار اپنی چندھی آنکھوں کو مچ مچ کر کے سنتا رہا۔ وہ عام طور سے ایسے موقعوں پر خاموش نہیں رہتا تھا مگر شاید اس مرتبہ حاجی صاحب مرحوم کا لحاظ کر کے بڑے جبر سے بیٹھا رہا۔ اُدھر ولی محمد گیا اور اِدھر مختار بیڑی نے مُڑ کر خلیل خاں کے منھ پر چاند مار کہ بیڑی کا دُھواں پھونکتے ہوئے پوچھا: ''کیوں برخوردار! جاؤ گے سالے چالیسویں کا تر مال کھانے؟''

خلیل خاں نے اس بدتمیزی پر تیوری چڑھا کر جواب دیا: ''ہاں ہاں! جائیں گے کیوں نہیں؟ اللہ کے کام سے جی چرائیں گے کیا؟ اور یہ تم ہر وقت بے لگام کیوں رہتے ہو، کوئی بات بغیر گالی دئے نہیں کہہ سکتے کیا؟''

مختار بیڑی بے اختیار اپنی مخصوص ہنسی سے بے حال ہو گیا۔ ''کھی کھی کھی! ہاں ہاں کرتے کیوں نہیں ہیں، مگر صرف تمہاری بھابھی سے! تم جیسے گھامڑوں سے نہیں!''

اس نے خلیلؔ خاں کو آنکھ ماری: ''مگر تو چالیسویں میں جا کر کرے گا کیا سالے؟ یہ کیا ان:۔۔۔۔:نے بیسواں چالیسواں لگا رکھا ہے۔ سب سالی ہندوؤں کی رسمیں پال رکھی ہیں۔ بیٹھ کر قورمہ اور بریانی پر ہاتھ صاف کریں گے اور پھر سالن میں نمک ٹھیک نہ ہونے کی شکایت کریں گے۔ حاجی صاحب بیچارے تو سدھار گئے، اب یہ سالے مفت خورے تو انہیں یاد بھی نہیں کریں گے کبھی۔'' تقریر سے فارغ ہو کر اس نے میری جانب دیکھا جیسے میری تائید چاہ رہا ہو۔ میں نے جھٹ سڑک پر سے گذرتی ہوئی اینٹوں سے لدی گاڑی پر یوں نگاہیں گاڑ دیں جیسے گاڑی دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ میں مختارؔ بیڑی سے خوب واقف تھا۔ کون اس کانٹے دار جھاڑی سے الجھ کر اپنا دامن تار تار کراتا!

خلیلؔ خاں نے معاملہ رفع دفع کرنے کے لئے مختارؔ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا: ''تم تیار رہنا۔ میں اُدھر ہی آ جاؤں گا پھر اِس خبیث اور کاٹھم کو لیتے ہوئے منشی جی کی طرف چلیں گے۔ میں تو عصر گھر سے ہی پڑھ کر نکلوں گا۔''

یہ آخری جملہ بالکل غیر ضروری تھا اور اس کا مقصد ہم بے دین لوگوں کو جتانا تھا کہ ''تمہارے ساتھ میری دنیا تو مجبوراً'' خراب ہو رہی ہے مگر عاقبت پر تو مجھے اختیار ہے!''

مختارؔ بیڑی پر ایسے اوچھے حملے کا پہلے کب اثر ہوا تھا جو آج ہوتا۔ بیڑی نالی میں پھینک کر دوکان کے تختہ سے اٹھتا ہوا بولا: ''ابے، جب اپنی نماز پڑھے تو ہمارے لئے بھی پڑھ لینا! ثواب ملے گا۔ آخر لوگ دوسروں کی طرف سے حج وج بھی تو کرتے ہیں، پھر نماز میں سالا ایسا کیا سُرخاب کا پر لگا ہوا ہے؟ اور ہاں بیٹا! چالیسویں والے دن ہمیشہ کی طرح فاقہ کرنا نہ بھولنا ورنہ وہاں پیٹ بھر نہیں کھا پائے گا۔ اچھا سلا مالیکم!''

خلیلؔ خاں جھلا کر کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ مختارؔ بیڑی پلٹ کر چل دیا اور میں بھی کھسیانی مسکراہٹ میں دانت نکوس کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

منشی خوشیؔ محمد نے حاجی صاحب کی فاتحہ کا واقعی بڑا زبردست انتظام کر رکھا تھا۔ ساری گلی بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ دو طرف قناتیں لگا کر دریاں بچھا دی گئی تھیں فرشی انتظام تھا۔ بیچ میں لمبا زرد رنگ کا نقشین دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر شکر پاروں کے بے ڈول ڈزائن کے درمیان نہایت بھونڈے سیاہ حرفوں میں جگہ جگہ یہ شعر لکھا ہوا تھا:

شکر بجا آر کہ مہمان تو۔۔۔روزی خودمی خورد از خوان تو

دسترخوان کے دونوں طرف پھسکڑا مارے لوگوں کی قطار بقول مختارؔ بیڑی ''لمبے لمبی ہاتھ مار رہی تھی''۔ قورمہ، زردہ، بریانی اور نان! آج جی بھر کر کھا لو میاں! کل سے پھر وہی گھر کا پھیکا سیٹھا کھانا ملے گا! ایک کونہ میں رحمانیؔ یتیم خانہ سے بلوائے ہوئے پندرہ بیس بچے خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ معمولی پرانے کپڑے پہنے، بڑھے ہوئے بال، بھوکی ویران آنکھیں اور تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ، جیسے ڈر ہو کہ کوئی آ کر سامنے سے کھانا اٹھا کر نہ لے جائے۔ اُن کے ساتھ دسترخوان پر ایک بزرگ بھی بیٹھے کھا رہے تھے۔ نکلتا ہوا قد، کھلی رنگت، سفید براق سی داڑھی، چہرہ کی رونق نورانی آنکھوں میں لگے سُرمے سے اور بڑھ گئی تھی۔ سر پر دو پلی ٹوپی، بدن پر ڈھیلا ڈھالا لمبا گیروا کرتا اور بڑے گھیر کا پاجامہ، کاندھے پر سرخ چار خانہ دار رومال اور ہاتھ میں کالے منکوں کی بڑی سی تسبیح جو اس وقت بحالت مجبوری اپنے گھٹنے کے پاس دری پر رکھی ہوئی تھی۔ شاید رحمانیؔ یتیم خانے کے نگراں تھے۔ ہم انہیں دوسری جگہوں پر بھی یتیموں کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔ نہایت بے ضرر سے انسان تھے۔ جہاں بھی موت یا زندگی کے کسی موقع پر یتیم خانے سے بچے بلوائے جاتے تھے یہ بزرگ بھی ساتھ ہوتے تھے۔ خاموشی سے آتے، جتنی دیر بیٹھتے تسبیح پھیرتے رہتے تھے اور کھانا ختم ہونے پر خاموشی سے ہی یتیموں کی ٹولی کے ساتھ ہی واپس چلے جاتے تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

محفل کی ہماہمی میں باورچی گھر سے مہمانوں کو کھانا پہنچانے والوں کو بھلا کہاں فرصت تھی کہ یتیم بچوں کی جانب توجہ کرتے۔ وہ ویسے ہی کیا کم مصروف تھے۔ چاروں طرف سے برابر آوازیں آ رہی تھیں:

''بھئی! ذرا گرم چاول کا طباق ادھر بڑھا دیں۔ یہ چاول تو بالکل ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔''

''میاں! کیا سالن ہی سالن لا رہے ہو! بوٹیاں تو جیسے ہیں ہی نہیں۔''

''مرزا جی! ذرا رائتے کا ڈونگا ادھر کھسکا دیں۔ اور ہاں نان بھی!''

''واہ واہ صاحب، واہ واہ! کھانا کس قدر اچھا ہے۔ حاجی صاحب کی روح کیسی خوش ہو رہی ہوگی۔''

یہ تو معلوم نہیں کہ حاجی صاحب مرحوم کی روح کتنی خوش تھی البتہ یتیم بچے ضرور سہمی سہمی نظروں سے پلیٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ مختارؔ بیڑی کو ان کی بیکسی پر تاؤ آ گیا تھا۔ اپنا کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، کسی سے تو اس نے کچھ نہیں کہا، بس باورچی خانے سے کھانے کی کھیپ جلدی جلدی لا کر یتیموں میں تقسیم کرنے لگا تھا۔ خلیلؔ خاں اس کی اس احمقانہ حرکت پر سر ہلا کر قورمہ کی طرف پھر متوجہ ہو گئے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ: ''اس پاگل کا کیا ہے۔ ایسی حرکتیں تو یہ روز ہی کرتا رہتا ہے! لاحول ولا قوۃ!''

کھانا کھا کر یتیم بچے جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو مختارؔ نے جیب سے کچھ نوٹ نکال لئے جو شاید کل ہی شام ہم سے تاش میں جیتے تھے۔ وہ بچوں کے پاس گیا اور ہر بچہ کے ہاتھ میں پانچ پانچ روپے رکھنے لگا۔ بچے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب کوئی ان سے ہمدردی سے پیش آیا تھا۔ ایک بچہ نے روپے دیکھ کر کہا: ''ساب ہم اس کا کیا کریں گے؟''

مختارؔ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''بیتا! کچھ لے کر کھا لینا۔''

اس بچہ نے مایوسی سے روپے مختارؔ بیڑی کی ہتھیلی پر واپس رکھ کر جواب دیا: ''ساب ہم یتیم کھانے واپس جائیں گے تو مولی ساب ہم سے سب چھین لیں گے۔ ہمیں تھوڑی ملے گا۔''

مختارؔ بیڑی اکدم غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ ''ابے کیسے لے لیں گے، ان کے باپ کا مال ہے کیا؟ چلو میرے ساتھ۔ میں ابھی مولی ساب سے بات کرتا ہوں۔ سالوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

لڑکا سہم ہی تو گیا۔ ڈرتے ڈرتے بولا: ''مگر ساب یہاں تو مولی ساب نہیں ہیں۔ پھر انہیں معلوم ہوگا کہ ہم نے شکایت کی ہے تو بہت ماریں گے۔''

مختار اب بے قابو ہو چلا تھا: ''ابے ماریں گے کیسے، میں جو موجود ہوں۔ وہ مولی ساب سامنے بیٹھے ہیں۔ تو چل میرے ساتھ۔ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں میں سب!''

اُس نے ان بزرگ صورت نگراں کی جانب اشارہ کیا جو بڑی سی ڈکار لے کر تسبیح ہاتھ میں لٹکائے جانے کو تیار تھے۔

یتیم بچہ نے ایک نظر اُن بزرگ کو دیکھا اور پھر مسکرا کر مختارؔ سے بولا: ''ساب! یہ مولی ساب تھوڑی ہیں۔ یہ تو مالوم نہیں کون ہیں۔ یتیم کھانے کے دروازے پر بیٹھے رہتے ہیں اور جب ہم لوگ کہیں کھانے پر جاتے ہیں تو ساتھ ہو لیتے ہیں۔ ان کا تو روج کا یہی کام ہے۔''

اڑا اڑا دھم! مختارؔ سکتہ کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے ہاتھ گھما کر اس کو ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ ابھی وہ اس کیفیت سے نکل نہیں سکا تھا کہ خلیلؔ خاں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے مختارؔ بیڑی کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اُس دن کے بعد سے مختارؔ کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ تاش کھیلتے کھیلتے سوچ میں ڈوب جاتا مگر اتنا بھی نہیں کہ ہار جائے! چال ڈھال کا پرانا والہانہ پن البتہ قدرے کم ہو گیا تھا۔ گالیاں وہ عادتاً'' اب بھی دیتا تھا لیکن ان میں پہلی سی بے ساختگی اور پھکڑ پن نہیں تھا۔ کہاں تو خلیلؔ خاں اسے نیکی کی تلقین کرتے تھے اور سید کاظمؔ حسین اس کی گالیوں پر بھنا کر جوابی گالی رسید کرتے تھے اور کہاں اب اس کی خاموشی سے پریشان تھے۔ طرح طرح سے اسے چھیڑتے اور چٹکیاں لیتے مگر وہ ان کی حرکتوں پر مسکرا کر چاند مار کہ بیڑی کا دھواں ہَوا میں اڑا دیتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یا تو اداکاری کر رہا تھا یا پھر چالیسویں والے دن کی بات کا اثر وقت کے ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ مختارؔ بیڑی کے سنورنے اور شرافت کا چولا اختیار کر لینے کا تصور بھی ہمارے لئے مشکل تھا۔ آخر چور چوری سے تو جا سکتا ہے، ہیرا پھیری سے تو کب جاتا ہے؟

ایک شام ہم تینوں مختارؔ کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ کلثومؔ بھابھی چائے لے کر آئیں تو خلیلؔ خاں سے نہیں رہا گیا اور مختارؔ کی خاموشی اور بیدلی کی شکایت کر بیٹھے۔ بھابھی جیسے بھری بیٹھی تھیں:

''اے ہے! بھائی صاحب، میں تو خود دُگدھا میں پڑی ہوئی ہوں۔ جنے ان کو کیا ہو گیا ہے! گھر سے پہلے بھی انہیں کون سی دلچسپی تھی اور اب تو یوں رہوے ہیں جیسے مُوا کسی غیر کا گھر ہو۔ میں تو سمجھو ہوں کہ ان کو کسی کی نظر لگ گئی ہے!''

ان کی ایسی معصوم بات پر میں بیساختہ مسکرا دیا اور کاظمؔ تو باقاعدہ کھی کھی کرنے لگا۔ خلیلؔ خاں البتہ کھنکھارنے کے بہانے انگوچھا منھ پر رکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپا گئے۔ مختارؔ بیڑی اور نظر؟ لاحول ولاقوۃ! میں نے کلثومؔ بھابھی سے کہا: ''بھابھی، آپ بھی کیا بات کرتی ہیں! یہ نظر وظر کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ سب وہم ہے وہم! چند روز میں دیکھئے گا کہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا یہ!''

کاظمؔ حسین نے جیسے نہلے پر دہلا مارا: ''ارے بھابھی! کیسی نظر اور کہاں کی نظر! ذرا اس شکل کو تو دیکھو۔ ایمان کی کہو بھلا ایسی صورت کو نظر لگ سکتی ہے؟''

کلثومؔ بھابھی نے اَدبدا کر اپنے شوہرِ نامدار کی طرف دیکھا تو ظالم نے مسکرا کر انہیں آنکھ مار دی! وہ غریب ہڑبڑا کر ایسی جھینپیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ کاظمؔ تو کرسی سے لڑھک کر فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کلثومؔ بھابھی اپنی ہنسی دوپٹہ کے پلو میں چھپائے مصنوعی غصہ سے بڑبڑاتی ہوئی کمرہ سے نکل گئیں: ''توبہ، توبہ! نہ اللہ مارا وقت دیکھیں، نہ آدمی پہچانیں۔ نگوڑی کوئی تُک ہے آخر؟ اس عمر کو پہنچ گئے مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ ایں نہیں تو!''

اُس دن سے یہ ضرور ہُوا کہ مختارؔ بیڑی کی طبیعت کا غبار تیزی سے چھٹنے لگا اور جلدی ہی وہ اپنی پرانی حرکتوں پر آ گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی بحالیٔ طبیعت کے ساتھ تاش کی بازیاں بھی تیز ہو گئیں اور اسی تناسب سے ہماری جیبیں بھی خالی ہونے لگیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سودا ایسا مہنگا نہیں تھا!

آج بازار کچھ مندا چل رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں خلیلؔ خاں کی دوکان پر پہنچا تھا تو اس نے شکایت کی تھی۔ ویسے بھی اس کا کہنا تھا کہ ہفتہ کے درمیانی دنوں میں لوگ خریداری کم کرتے تھے۔ اسی لئے تو سرکار کی طرف سے منگل کو بازار بند کرنے کا حکم تھا۔ ویسے خلیلؔ خاں کی شکایت کرنے کی عادت پرانی تھی۔ بازار کی شکایت نہ کرتا تو بیوی بچوں کا گلہ کرتا یا ہندوستان پاکستان کے کرکٹ میچوں پر تقریر کرتا۔ ادھر جب سے اس پر اسلام کے دورے پڑنے لگے تھے وہ موقع بے موقع نماز اور روزے کی فضیلت، قیامت کے ہوش رُبا منظر اور دوزخ کی آگ سے بھی ہم لوگوں کو ڈرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ مختارؔ بیڑی اُس کی باتوں پر مسکرا کر بیڑی کا ایک لمبا کش لیتا اور اُس کے چہرہ پر دُھواں پھونک کر کہتا: ''سالے کی گھر میں بھابھی کے سامنے بولتی بند رہتی ہے تو یہاں دوکان پر بیٹھ کر باتیں بگھارتا ہے۔ نامرد ہے سالا نامرد!''

دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

لڑکا سہم ہی تو گیا۔ ڈرتے ڈرتے بولا: ''مگر ساب یہاں تو مولی ساب نہیں ہیں۔ پھر انہیں معلوم ہوگا کہ ہم نے شکایت کی ہے تو بہت ماریں گے۔''

مختار اب بے قابو ہو چلا تھا: ''ابے ماریں گے کیسے، میں جو موجود ہوں۔ وہ مولی ساب سامنے بیٹھے ہیں۔ تو چل میرے ساتھ۔ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں میں سب!''

اُس نے ان بزرگ صورت نگراں کی جانب اشارہ کیا جو بڑی سی ڈکار لے کر تسبیح ہاتھ میں لٹکائے جانے کو تیار تھے۔

یتیم بچہ نے ایک نظر اُن بزرگ کو دیکھا اور پھر مسکرا کر مختارؔ سے بولا: ''ساب! یہ مولی ساب تھوڑی ہیں۔ یہ تو مالوم نہیں کون ہیں۔ یتیم کھانے کے دروازے پر بیٹھے رہتے ہیں اور جب ہم لوگ کہیں کھانے پر جاتے ہیں تو ساتھ ہو لیتے ہیں۔ ان کا تو روج کا یہی کام ہے۔''

اڑا اڑا دھم! مختارؔ سکتہ کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے ہاتھ گھما کر اس کو ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ ابھی وہ اس کیفیت سے نکل نہیں سکا تھا کہ خلیلؔ خاں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے مختارؔ بیڑی کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اُس دن کے بعد سے مختارؔ کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ تاش کھیلتے کھیلتے سوچ میں ڈوب جاتا مگر اتنا بھی نہیں کہ ہار جائے! چال ڈھال کا پرانا والہانہ پن البتہ قدرے کم ہو گیا تھا۔ گالیاں وہ عادتاً'' اب بھی دیتا تھا لیکن ان میں پہلی سی بے ساختگی اور پھکڑ پن نہیں تھا۔ کہاں تو خلیلؔ خاں اسے نیکی کی تلقین کرتے تھے اور سید کاظمؔ حسین اس کی گالیوں پر بھنا کر جوابی گالی رسید کرتے تھے اور کہاں اب اس کی خاموشی سے پریشان تھے۔ طرح طرح سے اسے چھیڑتے اور چٹکیاں لیتے مگر وہ ان کی حرکتوں پر مسکرا کر چاند مار کہ بیڑی کا دھواں ہَوا میں اڑا دیتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یا تو اداکاری کر رہا تھا یا پھر چالیسویں والے دن کی بات کا اثر وقت کے ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ مختارؔ بیڑی کے سنورنے اور شرافت کا چولا اختیار کر لینے کا تصور بھی ہمارے لئے مشکل تھا۔ آخر چور چوری سے تو جا سکتا ہے، ہیرا پھیری سے تو کب جاتا ہے؟

ایک شام ہم تینوں مختارؔ کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ کلثومؔ بھابھی چائے لے کر آئیں تو خلیلؔ خاں سے نہیں رہا گیا اور مختارؔ کی خاموشی اور بیدلی کی شکایت کر بیٹھے۔ بھابھی جیسے بھری بیٹھی تھیں:

''اے ہے! بھائی صاحب، میں تو خود دُگدھا میں پڑی ہوئی ہوں۔ جنے ان کو کیا ہو گیا ہے! گھر سے پہلے بھی انہیں کون سی دلچسپی تھی اور اب تو یوں رہوے ہیں جیسے مُوا کسی غیر کا گھر ہو۔ میں تو سمجھو ہوں کہ ان کو کسی کی نظر لگ گئی ہے!''

ان کی ایسی معصوم بات پر میں بیساختہ مسکرا دیا اور کاظمؔ تو باقاعدہ کھی کھی کرنے لگا۔ خلیلؔ خاں البتہ کھنکھارنے کے بہانے انگوچھا منھ پر رکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپا گئے۔ مختارؔ بیڑی اور نظر؟ لاحول ولاقوۃ! میں نے کلثومؔ بھابھی سے کہا: ''بھابھی، آپ بھی کیا بات کرتی ہیں! یہ نظر وظر کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ سب وہم ہے وہم! چند روز میں دیکھئے گا کہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا یہ!''

کاظمؔ حسین نے جیسے نہلے پر دہلا مارا: ''ارے بھابھی! کیسی نظر اور کہاں کی نظر! ذرا اس شکل کو تو دیکھو۔ ایمان کی کہو بھلا ایسی صورت کو نظر لگ سکتی ہے؟''

کلثومؔ بھابھی نے اَدبدا کر اپنے شوہرِ نامدار کی طرف دیکھا تو ظالم نے مسکرا کر انہیں آنکھ مار دی! وہ غریب ہڑبڑا کر ایسی جھینپیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ کاظمؔ تو کرسی سے لڑھک کر فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کلثومؔ بھابھی اپنی ہنسی دوپٹہ کے پلو میں چھپائے مصنوعی غصہ سے بڑبڑاتی ہوئی کمرہ سے نکل

گئیں: ''توبہ، توبہ! نہ اللہ مارا وقت دیکھیں، نہ آدمی پہچانیں۔ نگوڑی کوئی تک ہے آخر؟ اس عمر کو پہنچ گئے مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ ایں نہیں تو!''

اُس دن سے یہ ضرور ہُوا کہ مختارؔ بیڑی کی طبیعت کا غبار تیزی سے چھٹنے لگا اور جلدی ہی وہ اپنی پرانی حرکتوں پر آ گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی بحالیٔ طبیعت کے ساتھ تاش کی بازیاں بھی تیز ہو گئیں اور اسی تناسب سے ہماری جیبیں بھی خالی ہونے لگیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سودا ایسا مہنگا نہیں تھا!

آج بازار کچھ مندا چل رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں خلیلؔ خاں کی دوکان پر پہنچا تھا تو اس نے شکایت کی تھی۔ ویسے بھی اس کا کہنا تھا کہ ہفتہ کے درمیانی دنوں میں لوگ خریداری کم کرتے تھے۔ اسی لئے تو سرکار کی طرف سے منگل کو بازار بند کرنے کا حکم تھا۔ ویسے خلیلؔ خاں کی شکایت کرنے کی عادت پرانی تھی۔ بازار کی شکایت نہ کرتا تو بیوی بچوں کا گلہ کرتا یا ہندوستان پاکستان کے کرکٹ میچوں پر تقریر کرتا۔ ادھر جب سے اس پر اسلام کے دورے پڑنے لگے تھے وہ موقع بے موقع نماز اور روزے کی فضیلت، قیامت کے ہوش رُبا منظر اور دوزخ کی آگ سے بھی ہم لوگوں کو ڈرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ مختارؔ بیڑی اُس کی باتوں پر مسکرا کر بیڑی کا ایک لمبا کش لیتا اور اُس کے چہرہ پر دُھواں پھونک کر کہتا: ''سالے کی گھر میں بھابھی کے سامنے بولتی بند رہتی ہے تو یہاں دوکان پر بیٹھ کر باتیں بگھارتا ہے۔ نامرد ہے سالا نامرد!''

دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

لڑکا سہم ہی تو گیا۔ ڈرتے ڈرتے بولا: ''مگر ساب یہاں تو مولی ساب نہیں ہیں۔ پھر انہیں معلوم ہوگا کہ ہم نے شکایت کی ہے تو بہت ماریں گے۔''

مختار اب بے قابو ہو چلا تھا: ''ابے ماریں گے کیسے، میں جو موجود ہوں۔ وہ مولی ساب سامنے بیٹھے ہیں۔ تو چل میرے ساتھ۔ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں میں سب!''

اُس نے ان بزرگ صورت نگراں کی جانب اشارہ کیا جو بڑی سی ڈکار لے کر تسبیح ہاتھ میں لٹکائے جانے کو تیار تھے۔

یتیم بچہ نے ایک نظر اُن بزرگ کو دیکھا اور پھر مسکرا کر مختارؔ سے بولا: ''ساب! یہ مولی ساب تھوڑی ہیں۔ یہ تو مالوم نہیں کون ہیں۔ یتیم کھانے کے دروازے پر بیٹھے رہتے ہیں اور جب ہم لوگ کہیں کھانے پر جاتے ہیں تو ساتھ ہو لیتے ہیں۔ ان کا تو روج کا یہی کام ہے۔''

اڑا اڑا دھم! مختارؔ سکتہ کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے ہاتھ گھما کر اس کو ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ ابھی وہ اس کیفیت سے نکل نہیں سکا تھا کہ خلیلؔ خاں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے مختارؔ بیڑی کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اُس دن کے بعد سے مختارؔ کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ تاش کھیلتے کھیلتے سوچ میں ڈوب جاتا مگر اتنا بھی نہیں کہ ہار جائے! چال ڈھال کا پرانا والہانہ پن البتہ قدرے کم ہو گیا تھا۔ گالیاں وہ عادتاً'' اب بھی دیتا تھا لیکن ان میں پہلی سی بے ساختگی اور پھکڑ پن نہیں تھا۔ کہاں تو خلیلؔ خاں اسے نیکی کی تلقین کرتے تھے اور سید کاظمؔ حسین اس کی گالیوں پر بھنا کر جوابی گالی رسید کرتے تھے اور کہاں اب اس کی خاموشی سے پریشان تھے۔ طرح طرح سے اسے چھیڑتے اور چٹکیاں لیتے مگر وہ ان کی حرکتوں پر مسکرا کر چاند مار کہ بیڑی کا دھواں ہَوا میں اڑا دیتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یا تو اداکاری کر رہا تھا یا پھر چالیسویں والے دن کی بات کا اثر وقت کے ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ مختارؔ بیڑی کے سنورنے اور شرافت کا چولا اختیار کر لینے کا تصور بھی ہمارے لئے مشکل تھا۔ آخر چور چوری سے تو جا سکتا ہے، ہیرا پھیری سے تو کب جاتا ہے؟

ایک شام ہم تینوں مختارؔ کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ کلثومؔ بھابھی چائے لے کر آئیں تو خلیلؔ خاں سے نہیں رہا گیا اور مختارؔ کی خاموشی اور بیدلی کی شکایت کر بیٹھے۔ بھابھی جیسے بھری بیٹھی تھیں:

''اے ہے! بھائی صاحب، میں تو خود دُگدھا میں پڑی ہوئی ہوں۔ جنے ان کو کیا ہو گیا ہے! گھر سے پہلے بھی انہیں کون سی دلچسپی تھی اور اب تو یوں رہوے ہیں جیسے مُوا کسی غیر کا گھر ہو۔ میں تو سمجھو ہوں کہ ان کو کسی کی نظر لگ گئی ہے!''

ان کی ایسی معصوم بات پر میں بیساختہ مسکرا دیا اور کاظمؔ تو باقاعدہ کھی کھی کرنے لگا۔ خلیلؔ خاں البتہ کھنکھارنے کے بہانے انگوچھا منھ پر رکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپا گئے۔ مختارؔ بیڑی اور نظر؟ لاحول ولاقوۃ! میں نے کلثومؔ بھابھی سے کہا: ''بھابھی، آپ بھی کیا بات کرتی ہیں! یہ نظر وظر کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ سب وہم ہے وہم! چند روز میں دیکھئے گا کہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا یہ!''

کاظمؔ حسین نے جیسے نہلے پر دہلا مارا: ''ارے بھابھی! کیسی نظر اور کہاں کی نظر! ذرا اس شکل کو تو دیکھو۔ ایمان کی کہو بھلا ایسی صورت کو نظر لگ سکتی ہے؟''

کلثومؔ بھابھی نے اَدبدا کر اپنے شوہرِ نامدار کی طرف دیکھا تو ظالم نے مسکرا کر انہیں آنکھ مار دی! وہ غریب ہڑبڑا کر ایسی جھینپیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہم لوگوں کا

ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ کاظمؔ تو کرسی سے لڑھک کر فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کلثومؔ بھابھی اپنی ہنسی دوپٹہ کے پلو میں چھپائے مصنوعی غصہ سے بڑبڑاتی ہوئی کمرہ سے نکل گئیں: ''توبہ، توبہ! نہ اللہ مارا وقت دیکھیں، نہ آدمی پہچانیں۔ نگوڑی کوئی تُک ہے آخر؟ اس عمر کو پہنچ گئے مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ ایں نہیں تو!''

اُس دن سے یہ ضرور ہُوا کہ مختارؔ بیڑی کی طبیعت کا غبار تیزی سے چھٹنے لگا اور جلدی ہی وہ اپنی پرانی حرکتوں پر آ گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی بحالیٔ طبیعت کے ساتھ تاش کی بازیاں بھی تیز ہو گئیں اور اسی تناسب سے ہماری جیبیں بھی خالی ہونے لگیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سودا ایسا مہنگا نہیں تھا!

آج بازار کچھ مندا چل رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں خلیلؔ خاں کی دوکان پر پہنچا تھا تو اس نے شکایت کی تھی۔ ویسے بھی اس کا کہنا تھا کہ ہفتہ کے درمیانی دنوں میں لوگ خریداری کم کرتے تھے۔ اسی لئے تو سرکار کی طرف سے منگل کو بازار بند کرنے کا حکم تھا۔ ویسے خلیلؔ خاں کی شکایت کرنے کی عادت پرانی تھی۔ بازار کی شکایت نہ کرتا تو بیوی بچوں کا گلہ کرتا یا ہندوستان پاکستان کے کرکٹ میچوں پر تقریر کرتا۔ ادھر جب سے اس پر اسلام کے دورے پڑنے لگے تھے وہ موقع بے موقع نماز اور روزے کی فضیلت، قیامت کے ہوش رُبا منظر اور دوزخ کی آگ سے بھی ہم لوگوں کو ڈرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ مختارؔ بیڑی اُس کی باتوں پر مسکرا کر بیڑی کا ایک لمبا کش لیتا اور اُس کے چہرہ پر دُھواں پھونک کر کہتا: ''سالے کی گھر میں بھابھی کے سامنے بولتی بند رہتی ہے تو یہاں دوکان پر بیٹھ کر باتیں بگھارتا ہے۔ نامرد ہے سالا نامرد!''

دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

لڑکا سہم ہی تو گیا۔ ڈرتے ڈرتے بولا: ''مگر ساب یہاں تو مولی ساب نہیں ہیں۔ پھر انہیں معلوم ہوگا کہ ہم نے شکایت کی ہے تو بہت ماریں گے۔''

مختار اب بے قابو ہو چلا تھا: ''ابے ماریں گے کیسے، میں جو موجود ہوں۔ وہ مولی ساب سامنے بیٹھے ہیں۔ تو چل میرے ساتھ۔ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں میں سب!''

اُس نے ان بزرگ صورت نگراں کی جانب اشارہ کیا جو بڑی سی ڈکار لے کر تسبیح ہاتھ میں لٹکائے جانے کو تیار تھے۔

یتیم بچہ نے ایک نظر اُن بزرگ کو دیکھا اور پھر مسکرا کر مختارؔ سے بولا: ''ساب! یہ مولی ساب تھوڑی ہیں۔ یہ تو مالوم نہیں کون ہیں۔ یتیم کھانے کے دروازے پر بیٹھے رہتے ہیں اور جب ہم لوگ کہیں کھانے پر جاتے ہیں تو ساتھ ہو لیتے ہیں۔ ان کا تو روج کا یہی کام ہے۔''

اڑا اڑا دھم! مختارؔ سکتہ کی سی حالت میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے ہاتھ گھما کر اس کو ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ ابھی وہ اس کیفیت سے نکل نہیں سکا تھا کہ خلیلؔ خاں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے مختارؔ بیڑی کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اُس دن کے بعد سے مختارؔ کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ تاش کھیلتے کھیلتے سوچ میں ڈوب جاتا مگر اتنا بھی نہیں کہ ہار جائے! چال ڈھال کا پرانا والہانہ پن البتہ قدرے کم ہو گیا تھا۔ گالیاں وہ عادتاً'' اب بھی دیتا تھا لیکن ان میں پہلی سی بے ساختگی اور پھکڑ پن نہیں تھا۔ کہاں تو خلیلؔ خاں اسے نیکی کی تلقین کرتے تھے اور سید کاظمؔ حسین اس کی گالیوں پر بھنا کر جوابی گالی رسید کرتے تھے اور کہاں اب اس کی خاموشی سے پریشان تھے۔ طرح طرح سے اسے چھیڑتے اور چٹکیاں لیتے مگر وہ ان کی حرکتوں پر مسکرا کر چاند مار کہ بیڑی کا دھواں ہَوا میں اڑا دیتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یا تو اداکاری کر رہا تھا یا پھر چالیسویں والے دن کی بات کا اثر وقت کے ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ مختارؔ بیڑی کے سنورنے اور شرافت کا چولا اختیار کر لینے کا تصور بھی ہمارے لئے مشکل تھا۔ آخر چور چوری سے تو جا سکتا ہے، ہیرا پھیری سے تو کب جاتا ہے؟

ایک شام ہم تینوں مختارؔ کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ کلثومؔ بھابھی چائے لے کر آئیں تو خلیلؔ خاں سے نہیں رہا گیا اور مختارؔ کی خاموشی اور بیدلی کی شکایت کر بیٹھے۔ بھابھی جیسے بھری بیٹھی تھیں:

''اے ہے! بھائی صاحب، میں تو خود دُگدھا میں پڑی ہوئی ہوں۔ جنے ان کو کیا ہو گیا ہے! گھر سے پہلے بھی انہیں کون سی دلچسپی تھی اور اب تو یوں رہوے ہیں جیسے مُوا کسی غیر کا گھر ہو۔ میں تو سمجھو ہوں کہ ان کو کسی کی نظر لگ گئی ہے!''

ان کی ایسی معصوم بات پر میں بیساختہ مسکرا دیا اور کاظمؔ تو باقاعدہ کھی کھی کرنے لگا۔ خلیلؔ خاں البتہ کھنکھارنے کے بہانے انگوچھا منھ پر رکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپا گئے۔ مختارؔ بیڑی اور نظر؟ لاحول ولاقوۃ! میں نے کلثومؔ بھابھی سے کہا: ''بھابھی، آپ بھی کیا بات کرتی ہیں! یہ نظر وظر کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ سب وہم ہے وہم! چند روز میں دیکھئے گا کہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا یہ!''

کاظمؔ حسین نے جیسے نہلے پر دہلا مارا: ''ارے بھابھی! کیسی نظر اور کہاں کی نظر! ذرا اس شکل کو تو دیکھو۔ ایمان کی کہو بھلا ایسی صورت کو نظر لگ سکتی ہے؟''

کلثومؔ بھابھی نے اَدبدا کر اپنے شوہرِ نامدار کی طرف دیکھا تو ظالم نے مسکرا کر انہیں آنکھ ماردی! وہ غریب ہڑ بڑا کر ایسی جھینپیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ کاظمؔ تو کرسی سے لڑھک کر فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کلثومؔ بھابھی اپنی ہنسی دوپٹہ کے پلو میں چھپائے مصنوعی غصہ سے بڑبڑاتی ہوئی کمرہ سے نکل گئیں: ''توبہ، توبہ! نہ اللہ مارا وقت دیکھیں، نہ آدمی پہچانیں۔ نگوڑی کوئی تُک ہے آخر؟ اس عمر کو پہنچ گئے مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ ایں نہیں تو!''

اُس دن سے یہ ضرور ہُوا کہ مختارؔ بیڑی کی طبیعت کا غبار تیزی سے چھٹنے لگا اور جلدی ہی وہ اپنی پرانی حرکتوں پر آ گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی بحالیٔ طبیعت کے ساتھ تاش کی بازیاں بھی تیز ہو گئیں اور اسی تناسب سے ہماری جیبیں بھی خالی ہونے لگیں۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ سودا ایسا مہنگا نہیں تھا!

آج بازار کچھ مندا چل رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں خلیلؔ خاں کی دوکان پر پہنچا تھا تو اس نے شکایت کی تھی۔ ویسے بھی اس کا کہنا تھا کہ ہفتہ کے درمیانی دنوں میں لوگ خریداری کم کرتے تھے۔ اسی لئے تو سرکار کی طرف سے منگل کو بازار بند کرنے کا حکم تھا۔ ویسے خلیلؔ خاں کی شکایت کرنے کی عادت پرانی تھی۔ بازار کی شکایت نہ کرتا تو بیوی بچوں کا گلہ کرتا یا ہندوستان پاکستان کے کرکٹ میچوں پر تقریر کرتا۔ ادھر جب سے اس پر اسلام کے دورے پڑنے لگے تھے وہ موقع بے موقع نماز اور روزے کی فضیلت، قیامت کے ہوش رُبا منظر اور دوزخ کی آگ سے بھی ہم لوگوں کو ڈرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ مختارؔ بیڑی اُس کی باتوں پر مسکرا کر بیڑی کا ایک لمبا کش لیتا اور اُس کے چہرہ پر دُھواں پھونک کر کہتا: ''سالے کی گھر میں بھابھی کے سامنے بولتی بند رہتی ہے تو یہاں دوکان پر بیٹھ کر باتیں بگھارتا ہے۔ نامرد ہے سالا نامرد!''

خلیل خاںؔ اس کو خونخوار نظروں سے دیکھ کر رہ جاتا اور کسی گاہک کی جانب متوجہ ہو جاتا۔ تبلیغی جماعتؔ کا ممبر بن جانے کے بعد سے اس نے مختار بیڑیؔ سے گالم گلوج کا تبادلہ تقریباً ''بند کر دیا تھا۔ چونکہ عادت بہت پرانی تھی اس لئے اس کا یکسر ختم ہو جانا ذرا مشکل تھا، کبھی نہ کبھی منھ سے کچھ نکل ہی جاتا تھا۔ میں خلیل خاںؔ کی تقریر اس کی منگوائی ہوئی چائے کی پیالی میں غرق کرتا ہوا سڑک پر لوگوں کا ہجوم دیکھتا جا رہا تھا کہ اس کا لڑکا جلیلؔ سائیکل بھگاتا ہوا دوکان پر پہنچا اور تیزی سے بریک لگا کر سائیکل کو دوکان کے تختے پر دھم سے لگا کر ہانپتا کانپتا دوکان پر چڑھ آیا۔ اس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''ابا جی! ابا جی! جلدی سے چلئے۔ مختارؔ چچا کو چوٹ لگ گئی ہے۔ وہ ادھر چوراہہ پر! بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔''

''ایں! کیا کہتا ہے بھئی؟ مختارؔ کو چوٹ لگ گئی ہے؟ تو نے خود دیکھا ہے کہ سنی سنائی اڑا رہا ہے؟'' خلیل خاںؔ نے پوچھا۔

''نہیں، ابا جیؔ! خدا کی قسم، میں نے خود دیکھا ہے۔ اُدھر چوراہہ پر موٹر سے ٹکر ہو گئی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

ہم لوگ بھاگم بھاگ ہانپتے کانپتے چوراہہ پر پہنچے تو وہاں سیکڑوں آدمیوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ بھیڑ کو چیر کر ہم دونوں آگے بڑھے تو سڑک کے کنارے مختار بیڑیؔ کا خون سے لت پت بے جان جسم پڑا ہوا تھا جس پر اس کے سرہانے بیٹھے کاظم حسینؔ نے اپنا کوٹ پردہ کے لئے ڈال رکھا تھا اور خود سڑک پر سر پکڑے رو رہا تھا۔ آہ! مختار بیڑیؔ! یہ کیا ہو گیا؟ خلیل خاںؔ بے اختیار مختارؔ کے بے جان جسم سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میرا حال بھی خراب تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہماری ساری کائنات ہی اڑا اڑا دھم کر کے ہمارے اردگرد ملبہ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی ہو۔ آنکھیں بار بار مختارؔ پر جاتیں اور پھر خون کی اس باریک لکیر کے ساتھ ساتھ دور تک چلی جاتیں جو نالی میں جا گری تھی۔ بھیڑ میں لوگوں کی بھنبھناہٹ کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں:

''ارے رام رام! یہ کیا ہو گیا؟ کون تھے یہ صاحب؟''

''چچ چچ چچ! مر گیا بے چارہ! پتہ نہیں کون ہوگا۔ ارے بھیا کوئی پولس اور اسپتال بھی گیا کہ نہیں؟''

''سالی ٹریفک بھی تو بالکل اندھی ہو گئی ہے۔ روج جہاں تہاں ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں سالے!''

''ارے بھائی! اللہ کی مرضی میں کسی کا کیا دخل ہے۔ ان کی اسی طرح لکھی تھی۔ ہم کو بھی ایک دن جانا ہے!''

اور ادھر پہلوانؔ پنواڑی دوکان کے تختہ پر منھ میں ڈبل پان دبائے اچھل اچھل کر ہر آنے والے کو وہ قصہ سنا رہا تھا جس کو معلوم نہیں وہ پہلے کتنی بار سنا چکا تھا۔

'' ارے بھیا! ہم نے سب کچھ اپنی پاپی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جوانی کسم اب تلک ساری تصویر پھلم کی ماف آنکھوں میں گھوم رہی ہے۔ کوئی جھوٹ تھووڑی بول رہے ہیں! اُدھر پلّی سڑک سے مکھتارؔ باؤ جی آ رہے تھے۔ روج اسی ٹائم آتے تھے اور چاند مارکہ بیڑی کا بنڈل اور ماچس لیتے تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے بیچارے۔ تو بھیا! کیا ہوا کہ جنے کدھر سے ایک بچہ دوڑ کر سالی سڑک پار کرنے لگا اور اُدھر سے آ رہی تھی دندناتی ہوئی جیپ! بچہ تو جرور ہی دب کر مر جاتا۔ پر مکھتارؔ باؤ جی اک دم سڑک کے بیچوں بیچ کود پڑے اور چھلانگ لگا کر بچہ کو نالی میں پرے دھکیل دیا۔ پر بھیا! وہ کُھد کو نہیں بچا سکے اور جیپ سے پچ سے دب گئے۔ باپ رے باپ! اتنا کھون نکلا جیسے کسی نے نلکا کھول دیا ہو۔

سب ہم نے دیکھا بھیا! کوئی جھوٹ تھوڑی بول رہے ہیں!۔۔''

اسی سہ پہر ہم تین دوستوں نے مختارؔ کی میت کو غسل دیا۔ جتنا پانی استعمال ہوا اتنے ہی آنسو بھی شامل ہو گئے ہوں گے۔ بالٹیاں بھر بھر کر پانی ختم ہو گیا مگر اس کے زخموں سے خون کا رسنا بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ کفن پہنایا تو جا بجا جیتے جاگتے خون کے دھبے رہ گئے تھے جیسے وہ دنیا کو بتانا چاہتے ہوں کہ ''دیکھو! شہید ایسے ہوتے ہیں!'' اُدھر کلثومؔ بھابی پڑوسنوں کے درمیان فرش پر گم سم سکتے کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ اِدھر اُدھر سے رہ رہ کر بچوں کی سسکیوں کی آواز سے یہ طلسم ٹوٹ جاتا تھا۔ سارا محلّہ جمع تھا اور فضا سوگوار تھی۔

نماز چوراہہ کی مسجد کے باہر ہوئی۔ سیکڑوں لوگ قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ ایک کاظم حسینؔ ہی تھا جو میت کے سرہانے زمین پر گھٹنوں میں سر دئے بیٹھا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے نماز کے لئے کہتا۔ جنازہ اٹھا تو وہ گہری سانس لے کر ساتھ ہو لیا اور تمام راستہ سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم چلتا رہا۔ اُدھر خلیل خاںؔ نے گہوارے کا ایک پایہ سنبھالا تو پھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کوئی کاندھا بدلنے کو آگے بڑھتا تو ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیتا۔ آدھے میل چل کر جب قدم لڑکھڑانے لگے تو لوگوں نے سمجھا بجھا کر کاندھا بدل لیا۔ دیکھتے دیکھتے جریب کی چوکی کا قبرستان آ گیا۔ مختارؔ اب اپنی منزل کو پہنچ رہا تھا۔

میت کو قبر میں اتارنے کے لئے میں پیروں کی جانب اتر گیا اور کاظم حسینؔ سرہانے۔ لوگوں نے ''ہوشیاری سے! ذرا سنبھل کے بھائی! بسم اللہ!'' کی آوازوں کے درمیان میت کو نیچے اتارا اور ہم دونوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اس کو سنبھال کر آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ کاظم حسینؔ نے جھک کر کفن کے سرہانے کے بند کھولے اور اپنے بدن کی آڑ میں قبر میں جھانکتے ہوئے لوگوں کی نظر بچا کر میت کے دائیں شانے کے نیچے کچھ رکھ دیا۔ میری نظر پڑی تو میں بے اختیار چونک پڑا! ارے، یہ کیا؟ میرے منھ سے کچھ نکلنے ہی والا تھا کہ کاظمؔ نے نظر اُٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اُف! کس قدر کرب تھا اُن آنکھوں میں! کیسی اُداسی! کیسی گھٹن! جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو:

''خدا کے لئے خاموش رہو سرورؔ! مجھے اپنے دوست کو یہ آخری تحفہ دے لینے دو۔ پھر تو میں اسے کچھ نہیں دے سکوں گا۔''

اور میں نے خاموشی سے نگاہیں جھکا لیں۔ میت کے پیروں کی طرف کے بند کھولے اور خلیلؔ خاں کا نیچے بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر قبر سے باہر آ گیا۔ کاظمؔ حسین نے قبر تختوں سے پاٹ دی اور آخری تختہ لگانے سے پہلے جھری میں سے اندر جھانکا جیسے خدا حافظ کہہ رہا ہو اور پھر آخری تختہ بھی لگا دیا گیا۔ ایک طرف سے آواز آئی: ''مٹی دے دیجئے!'' لوگوں نے دھپا دھپ تین تین مٹھیاں مٹی قبر میں ڈال دی اور ہاتھ جھاڑ کر ادھر اُدھر کھڑے ہو گئے۔ گورکن نے پھاوڑے سے قبر بھر دی۔ لوگوں نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے اور پلٹ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ مختارؔ بیڑی اب افسانہ بن چکا تھا۔

روایت مشہور ہے کہ قبر میں میت کے پاس فرشتے آتے ہیں اور مرحوم سے سوال و جواب کرتے ہیں۔ میں تھکا ہارا گھر کی جانب واپس جا رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ جب اللہ کے بھیجے ہوئے وہ فرشتے مختارؔ کے پاس آئے ہوں گے تو اُس کے پاس رکھے ہوئے چاند مارکہ بیڑی کے بنڈل کو دیکھ کر کیا کہا ہوگا؟

میلا دشریف

ٹانگہ ٹخ ٹخ کرتا بانس منڈی کے چوراہہ کی مسجد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اُس کی چھت پر آگے پیچھے منھ کئے دو لاؤڈ اسپیکر بندھے ہوئے تھے اور پچھلی سیٹ پر میلے کچیلے کرتے پاجامے اور پلاسٹک کی ہوائی چپل میں ملبوس، سر پر تیل سے چپکٹ دو پلی ٹوپی منڈھے ایک شخص مائکروفون میں کرخت آواز سے اعلان کر رہا تھا۔ محلّہ کے دس بارہ بچے اور دو چار بیکار نوجوان یونہی تانگہ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے حالانکہ اس کا اعلان دور سے بھی سنا جا سکتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے منڈھا ہوا یہ تانگہ اور اُس میں بیٹھا ہوا آدمی ان کی بے رنگ اور پھیکی زندگی میں چند لمحوں کے لئے شاید رنگ اور مزہ فراہم کر رہے تھے۔ مائکروفون والے اعلانچی کو بھی اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ سے ٹوپی درست کرتے ہوئے شین قاف پر زور دے کر اعلان میں مصروف تھا اور برابر فاتحانہ نظروں سے پاس کھڑی ہوئی بے ہنگم بھیڑ کو دیکھ رہا تھا:

''برادرانِ اسلام! اگلی سنیچر، پچیس ستمبر کو رات کے آٹھ بجے محلّہ چمن گنج کے محمد علی پارک میں میلاد شریف کا ایک عظیم الشان جلسہ ہونے والا ہے۔ اس میں مولانا محمد حسین فرنگی محل اور مفتی عبدالسمیع صاحبان بیان فرمائیں گے۔ میلاد شریف کے بعد مچھلی بازار کے حاجی پریس کے مالک حافظ حاجی سلیم احمد صاحب کی طرف سے تبرک تقسیم کیا جائے گا۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ جلسہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہو کر اسے کامیاب بنائیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔''

تبرک کا نام سن کر لڑکوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تانگا دو ایک مرتبہ اعلان کر کے آگے بڑھ گیا اور دیر تک دور سے اس کی آواز آتی رہی: ''برادرانِ اسلام! اگلی سنیچر، پچیس ستمبر کو۔۔۔''

قریب ہے مسلم ہوٹل میں چائے پیتے اور نمک پارے ٹھونگتے ہوئے ثناء اللہ نے میری طرف دیکھ کر کہا: ''سرورؔ بھائی! یہ میلاد ویلاد کا کیا چکر اِن ملاٹوں نے لگا رکھا ہے؟ اور کوئی کام انہیں کرنے کو نہیں رہ گیا ہے کیا؟ جتنا پیسا ان جلسوں جلوسوں میں پھونکتے ہیں اس سے غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی پرورش وغیرہ کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ اس میں تو شاید ثواب بھی مل جائے گا۔ ان خالی خولی تقریروں سے کیا حاصل ہوتا ہے؟''

ثناء اللہ آج شاید تقریر کے موڈ میں تھے۔ یوں بھی وہ ''ملاٹوں'' پر جب بولنے پر آتے تو مشکل سے ہی رکتے تھے۔ پھر نہ موقع دیکھتے اور نہ آدمی پہچانتے تھے۔ جو دل میں ہوتا وہ کہہ مارتے تھے۔ میں ان کی کُھری طبیعت سے صرف واقف ہی نہیں تھا بلکہ خوف زدہ بھی تھا۔ ہماری دوستی بڑی پرانی تھی اور اُن کے اس کُھرے پن کے باوجود ان کے خلوص اور سادہ دلی کی مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔

میں نے ان کو ٹھنڈا کرنے کی نیت سے سموسوں کی طشتری ان کی طرف کھسکائی اور کہا: ''چھوڑیں بھائی! آپ بھی کس بحث میں پڑ گئے۔ ہمیں کون سا میلاد شریف کے جلسہ میں جا کر بور ہونا ہے یا چندہ دینا ہے! حاجی سلیم احمد میلاد کرا رہے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔''

ثناء اللہ بجائے ٹھنڈا ہونے کے اور بھنا گئے: ''ارے واہ! یہ بھی خوب رہی۔ کب تک یہ لوگ دوسروں کو بے وقوف بناتے رہیں گے؟'' پھر انہوں نے پہلو بدل کر بحث کی پٹری بدلی:

''اور یہ ہمیشہ برادرانِ اسلام کو ہی کیوں جلسوں میں بلایا جاتا ہے؟ ہمشیرانِ اسلام نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جو انہیں نہیں بلاتے ہیں؟ ثواب دارین میں ہمشیرانِ اسلام کا حصہ نہیں ہے کیا؟ اگر نہیں تو پھر جنت میں مرد ہی مرد ہوں گے! یہ تو سالی عجیب سی بات ہوئی۔ پھر ہماری بیویوں کا کیا ہوگا؟'' ثناء اللہ اب اپنی مخصوص ترنگ میں آ چکے تھے اور انہیں روکنا میرے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

''کیوں سرورؔ بھائی! اگر میری بیوی جنت میں گئی تو مجھ کو ملے گی کہ کسی اور کے حصہ میں آئے گی؟ لیجئے اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا!''

یہ ثناء اللہ کی ایک خاص ادا تھی کہ بات کرتے کرتے انہیں لطیفے بہت یاد آتے تھے جو عموماً بے تُکے اور بے ڈھنگے ہوتے تھے۔ پھر مزا یہ تھا کہ آپ انہیں کتنا ہی منع

کریں وہ لطیفہ سنانے سے باز نہیں آتے تھے اور اپنے لطیفوں پر اتنی فراخ دلی سے خود ہی ہنستے تھے کہ دوسروں کے مسکرانے کی بھی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی!

میں نے رسمی طور سے مسکرا کر کہا: ''اب آپ لطیفہ سنائے بغیر تو مانیں گے نہیں۔ تو پھر سنا ہی دیں۔''

''ہوا یوں کہ ایک مولوی صاحب ایک پٹھان کو نیک کام کرنے کی ہدایت دے رہے تھے اور ساتھ ہی اس کو جنت کے خواب بھی دکھا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ''خان صاحب! اللہ آپ پر کتنا مہربان ہے کہ ایک تو آپ کو جنت ملے گی پھر اُس کی رحمت سے آپ کی بیوی بھی وہاں آپ کو مل جائے گی!'' خان صاحب نے لال پیلے ہو کر ان کو جواب دیا: ''خو! پر اَمارے جنت میں جانے کا کیا فائدہ ہوا؟''

لطیفہ سنا کر ثناء اللہ نے اس قدر زبردست قہقہہ لگایا کہ کُرسی سے لُڑھکتے لڑھکتے بچے۔ دیر تک آنکھیں آدھی بند کئے، سر پیچھے اوندھائے قہہ قہہ ہنستے رہے۔ ہوٹل کے دوسرے گاہکوں نے مڑ کر انہیں گھورا بھی مگر ان پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہ پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ اب ہوا۔ تھوڑی دیر بعد سنبھل کر مجھ سے کہنے لگے:

''سرورؔ بھائی! اب کی بار ہم لوگ میلاد شریف کے جلسہ میں کیوں نہ چلیں؟ دیکھیں تو سہی کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔''

میرے ذہن میں بجتی ہوئی خطرہ کی گھنٹی شاید انہوں نے بھی محسوس کر لی! مسکرا کر یوں بولے: ''اچھا یوں کریں کہ بالکل آخر میں پہنچیں۔ لمبی چوڑی تقریر سننے سے بھی بچ جائیں گے اور تبرک الگ ملے گا۔ کیوں کیا خیال ہے؟'' ان کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

میں نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا: ''بھئی چلا تو چلوں گا لیکن وہاں حاصل کیا ہوگا؟ پھر آپ کی طبیعت سے بھی ڈر ہی لگتا ہے۔ میلاد شریف ہے، کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں ہے۔ الٹی سیدھی بات کر دی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

ثناء اللہؔ نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''نہیں بھئی! قسم خدا کی۔ وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بس ذرا چل کر یوں ہی دکھے لیتے ہیں۔ تو پھر طے ہے نا؟''

میں نے حامی بھر لی: ''چلیں ٹھیک ہے۔ اب چائے ختم کریں۔ ٹھنڈی ہوئی جا رہی ہے۔''

ثناء اللہؔ میرے وعدہ پر خوشی سے کھل اٹھے: ''لیجئے! چائے پر ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔'' اور پھر میری اجازت کا انتظار کئے بغیر ہی لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔

''سرورؔ بھائی! ایک شخص ایک سردار جی کی چائے کی دوکان پر گیا اور پوچھا کہ: سردار جی! لپٹن دی چاہ ہے؟: سردار جی نے مسکرا کر جواب دیا کہ: مینوں تو نہیں ہے۔ تینوں ہے تو آ جا!:''

لطیفہ سنا کر ثناؔء اللہ نے اس قدر زبردست قہقہہ لگایا کہ میں سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی وہ بھی جھومتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور رومال سے آنکھیں پوچھتے ہوئے ہوٹل سے نکل گئے۔

اُس شام بیگم نے چائے میں شکر کا چمچہ گھولتے گھولتے رک کر میری جانب حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا: ''آپ میلاد شریف سننے جا رہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟ آخر یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟ آپ تو میلاد وغیرہ کے قائل نہیں ہیں!''

بیویوں کے متعلق میرا عقیدہ ہے کہ وہ شوہروں کے بارے میں جتنا سوچتی ہیں اتنا الفاظ میں بیان نہیں کرتی ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بیشتر باتیں اپنے لب و لہجہ، گردن کے خم، نگاہوں کے زاویوں اور چہرہ کے اُتار چڑھاؤ سے ادا کرتی ہیں۔ اِس وقت بھی اُن کی نظروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میری عقل کی صحت پر خاصہ شبہ ہو چلا تھا۔

میں نے کھسیا کر اپنی مدافعت کی کمزور سی کوشش کی: ''ارے بھئی! قائل تو میں اب بھی نہیں ہوں۔ بس وہ ثناء اللہؔ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ان کی ضد پر ذرا کی ذرا چلا جاؤں گا۔ یوں ہی تفریحاً''، اور کیا!''

بیگم نے شامی کباب کا ایک نازک سا نوالہ کانٹے میں چبھو کر ہونٹوں سے دبک لیا اور بڑی گمبھیر آواز میں بولیں: ''ہوں ں ں!''

یہ ''ہوں ں ں'' مجھ سے میرا مزاج پوچھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جیسے کہہ رہی ہو کہ: ''دماغ تو صحیح ہے کہ نہیں؟ کیا گھاس کھا گئے ہیں؟'' لیکن ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کے درمیان سے جو آواز آئی وہ کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔

''آپ میلاد شریف میں ثناء اللہؔ بھائی کے ساتھ جا رہے ہیں؟ اور انہوں نے وہاں کچھ اوٹ پٹانگ کہہ سن دیا تو کیا ہوگا؟'' ان کے لہجہ میں اب سراسیمگی اور فکر جھلک رہی تھیں۔

''ارے بھئی نہیں، انہوں نے قسمیہ وعدہ کیا ہے کہ خاموش رہیں گے۔ ویسے بھی ہم لوگ میلاد کے بالکل آخر میں پہنچیں گے جب سلام وغیرہ پڑھا جا رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر دیکھ بھال کے آجائیں گے۔''

بیگم نے میری ناعاقبت اندیشی پر ٹھنڈی سانس بھر کر ماتمی انداز میں چائے کی ٹرے اٹھالی اور مجھ پر ایک مایوسی بھری نگاہ ڈالی۔ پھر وہ سر ہلاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

محمد علی پارک اُس رات رنگ برنگے بجلی کے سیکڑوں قمقموں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ جہاں دو ایک بجلی کے کھمبے اپنے چند ھے بلبوں سے چند قدموں دور تک ہی مرگھلی روشنی ڈالا کرتے تھے وہاں روشنی سے رات بھی دن ہو کر رہ گئی تھی۔ پارک کے کونے میں ایک طرف تخت کا اونچا اسٹیج بنا ہوا تھا جس کے چاروں جانب ہرے رنگ کے کپڑے کی چوڑی جھالر ٹنکی ہوئی نیچے زمین کو بوسہ دے رہی تھی۔ اسٹیج کے پیچھے بانسوں کی دیوار سی بنا کر ایک سفید چادر تان دی گئی تھی جس پر سنہرے خوبصورت اور موٹے موٹے الفاظ میں لکھا ہوا تھا:

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ﷺ

جلسہء میلادُ النبی، زیر اہتمام ''انجمنِ خدام الاسلام

مہتمم: حافظ حاجی سلیمؔ احمد عفی عنہ (حاجی پریس والے)

آخری جملہ یقیناً عوام کو غلط فہمی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے تھا کہ لوگ اس نیک کام کو کسی اور سلیم احمدؔ کا کارنامہ نہ سمجھ بیٹھیں۔ اسٹیج پر سجی میز کے پیچھے کرسیوں پر کئی باریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک بزرگ قریب ہی کھڑے مائکروفون پر اپنی تقریر کے آخری لمحوں کو ہاتھ میں پڑی ہوئی تسبیح ہلا ہلا کر امکانی حد تک پُر اثر بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کونہ کی کرسی پر حاجی سلیم احمدؔ صاحب بیٹھے نہایت فخریہ انداز سے سامعین کا جائزہ لے رہے تھے کہ دیکھو میلاد ایسے ہوا کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ چہرہ پر حیرت کا سایہ سا آیا جسے حاجی صاحب نے فوراً'' ہی ہلکی سی مسکراہٹ میں چھپا لیا۔ اِدھر تقریر ختم ہوئی اور اُدھر مفتی عبدالسمیعؔ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اُمت مسلمہ کی فلاح اور ترقی کی تقریباً'' پانچ منٹ لمبی دُعا مانگی جس پر آمین کہتے کہتے لوگوں کے گلے خشک ہو چلے تھے کہ مفتی صاحب نے ایک آخری آمین کہہ کر آنسوؤں سے گیلے چہرہ پر ہاتھ پھیر کر عوام کو اور زیادہ آزمائش سے بچا لیا۔ ابھی وہ پوری طرح بیٹھے بھی نہیں تھے کہ حاجی صاحب نے لپک کر مائکروفون پر قبضہ کر لیا:

''برادرانِ اسلام! جلسہ میں آپ سب کے آنے کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس کا اجرِ عظیم دے گا۔ حاجی پریس کی طرف سے پارک کے دروازہ پر تبرک لینا نہ بھولئے گا۔ السلامُ علیکم۔''

تبرک کا نام سنے ہی وہ بھگدڑ مچی کہ دیکھتے دیکھتے پارک خالی ہو گیا۔ حاجی سلیم احمدؔ صاحب نے مجھے اور ثناء اللہؔ کو اشارہ سے بلایا۔ اگر ثناء اللہؔ کو وہاں دیکھ کر ان کو برا لگا تھا تو ان کے بُشرہ سے اس کا قطعی کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میلاد شریف سے فارغ ہوئے تھے اور ان کا چہرہ نورِ ایمانی سے چمک رہا تھا۔ کمالِ محبت سے ہم دونوں کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سلام اور مصافحہ کے بعد انہوں نے کہا:

''بھئی خدائے قدوس کی قسم! آپ دونوں کو یہاں دیکھ کر مجھ کو کتنی خوشی ہوئی ہے میں کیا بتاؤں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایسا مبارک دن دیکھوں گا۔ مگر وہ ربِ کائنات وہ پتھر میں بھی جونک لگانے پر قادر ہے۔''

حاجی صاحب نے ہم دونوں پتھروں کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ پھر قریب کھڑے ایک شخص سے بولے: ''مستری جی! ذرا بھاگ کر تبرک کے دو ڈبل حصے تو لے آؤ۔ اور ہاں کہنا کہ چاندی کے ورق بھی لگا دیں۔''

اس مہمان نوازی سے شرمندہ ہو کر ہم لوگ کوئی جواب دے بھی نہیں پائے تھے کہ مستری جی لپک کر کاغذ میں لپٹے دو حصے لے آئے۔ اُن کے ساتھ ایک منحنی سا شخص اور تھا۔ کوٹ پتلون پہنے، ناک کی پھننگ پر چشمہ اٹکائے وہ مستری جی سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا اور جواب میں مستری جی بکرے کی طرح جلدی جلدی گردن ہلا رہے تھے۔ حاجی صاحب نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طشتری میں وہ حصے ہمیں پیش کئے اور بڑی رقت سے تاکید کی کہ ہم انہیں دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ ہم دونوں ابھی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ کیا کریں کہ حاجی جی نے مڑ کر پہلے اُس منحنی سے آدمی کو اور پھر مستری جی کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مستری جی نے ذرا سا آگے کھسک کر عرض کی: ''حاجی جیؔ! یہ پانڈے جی بجلی گھر کے اوورسیر ساب ہیں۔ پوچھ رہے ہیں کہ سڑک کے تاروں سے کُنڈے کب

اُتریں گے اور اپنی دستوری کا حساب کتاب بھی ساپھ کرنا چاہتے ہیں۔''

حاجی صاحب اس تقاضہ پر کھسیا سے گئے۔ سب کی موجودگی میں بجلی کے محکمہ کے دو کوڑی کے اوورسیر کا اس طرح منھ آنا انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا اور مصنوعی نرمی سے بولے: ''پانڈے جی! کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ بجلی تو سرکاری ہے۔ کوئی آپ کے گھر سے تو آئی نہیں تھی۔ کُنڈے ابھی اُتار لیں گے تو یہاں کا سامان کیسے نمٹے گا؟ صبح نکالئے گا کُنڈے۔ رہ گئی آپ کی دستوری تو ہمارا تو ہر سال کا یہ کام ہے۔ اس سے پہلے بجلی گھر والوں کے پیسے کب مارے گئے ہیں جو آج مارے جائیں گے؟ کل دوپہر بعد پریس آ کر پیسے لے لیجئے گا۔''

پانڈے جی اوورسیر صاحب نے چشمہ کو ایک انگلی سے ناک پر اور اوپر کھسکاتے ہوئے کہا کہ: ''حاجی ساب! کُنڈوں کی کوئی بات نہیں ہے۔ صبح تک اُتار لیں گے۔ پرنتو ہمارا حساب اسی سمے کر دیجئے۔ کل پُھرست نہیں ہوگی۔ سام کو میدہ باجار میں سری ستیہ نارائن کی کتھا ہے۔ وہاں پر کل کُنڈے ڈال کر بجلی کا سادھن کرنا ہے۔ پورا دن لگ جائے گا اس میں!''

ہم دونوں حاجی صاحب اور پانڈے جی کہ میلاد شریف کے لئے چرائی ہوئی سرکاری بجلی کا حساب کرتے ہوئے چھوڑ کر جب گھر کی جانب چلے تو ثناءاللہ بڑے خاموش خاموش تھے۔ معلوم نہیں اس موقع پر انہیں کوئی لطیفہ کیوں یاد نہیں آیا!

پچھل پائی

(پچھل پائی ایسی روایتی چڑیل کو کہتے ہیں جس کے پیروں کے پنجے پچھلے رُخ مُڑے ہوئے ہوں)

حمیدؔہ آپا دیر سے جائے نماز پر سجدہ میں پری ہوئی تھیں۔ اُن کے نحیف شانوں کے بار بار ہلنے اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی گھٹی گھٹی آواز سے ان کی آہ وزاری کا پتہ چلتا تھا۔ کوئی ان کے پاس بیٹھ کر غور سے اگر دیکھتا تو ان کے کانپتے ہوئے ہونٹ اور آنسوؤں سے تر جائے نماز دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ دو سال سے بے چاری بؔوا کا یہی حال تھا۔ جس دن سے اچھؔے میاں کو دورے پڑنے شروع ہوئے تھے حمیدؔہ بوا دنیا جہان سے بے خبر نیم دیوانی سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ کون سا علاج تھا جو انہوں نے اپنے چہیتے اور اکلوتے بیٹے کی صحت کے لئے نہیں آزمایا تھا۔ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا مگر اچھؔے میاں کے دورے تھے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

بیچارے حاجی سلیؔم احمد صاحب بھی بیٹے کی طرف سے فکر کرتے کرتے آدھے ہو کر رہ گئے تھے اور کاروبار کی جانب بھی توجہ پہلی سی نہیں رہ گئی تھی۔ جس ڈاکٹر، حکیم یا وید کا کوئی شخص ذکر کرتا، ماں باپ بھاگم بھاگ اس کے پاس پہنچ جاتے۔ ساتھ ہی اچھؔے میاں کو بھی گھسیٹ کر لے جاتے۔ چند دن علاج چلتا، بؔوا کو اتنا صبر کہاں تھا کہ ہفتہ دو ہفتہ جم کر علاج کراتیں۔ اِدھر دورہ پڑا اور اُدھر وہ کسی نئے ڈاکٹر کی طرف بھاگیں۔ بعض اوقات حاجی جی عاجز آ کر ان سے کہتے بھی تھے کہ: ''ارے بھئی! ذرا دوا کو کام تو کرنے دو۔ علاج شروع کئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟'' مگر دُکھیاری ماں کو اتنا چین نہیں تھا کہ وہ پوت کو آئے دن دوروں کی تکلیف میں تڑپتا دیکھتیں اور خاموش رہتیں۔

ویسے ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی بقولِ حمیدؔہ بوا ''فضیحتہ مچا رکھا تھا!'' کوئی کہتا کہ یہ دورے مرگی کی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔ کوئی بچپن میں دماغ میں لگی کسی چوٹ کا شبہ بیان کرتا۔ حکیم صاحب جگر کی گرمی اور اعصاب کی کمزوری تجویز کرتے تھے۔ خمیرہ گاؤزباں عنبریں جواہر والا اور جوارشِ جالینوس کی شیشیاں کی شیشیاں اچھؔے میاں ہضم کر گئے اور خدا جانے کتنے جوشاندے منھ بنا بنا کر پی گئے مگر دوروں کا وہی حال رہا۔ ایک وید نے موقع کی نزاکت نہ سمجھتے ہوئے شک ظاہر کیا کہ اچھؔے میاں کسی وجہ سے اداکاری کر رہے تھے۔ اس کے تو حمیدؔہ بوا نے وہ لتے لئے اور ایسی صلواتیں سنائیں کہ اللہ کی پناہ! اس کے بعد انہوں نے ویدوں کے پاس جانے کی قسم کھالی تھی۔

رحمٰن کی سرائے والی فخر النسؔا عرف فکّن بی کے سمجھانے پر ''روحانی علاج'' کی طرف سے بھی حمیدؔہ بوا غافل نہیں رہی تھیں۔ شہر اور آس پاس کا کوئی مولوی، سیانا اور جوگی ایسا نہیں بچا تھا جس کے در کی خاک انہوں نے نہ چھانی ہو۔ کوئی تعویز، گنڈا دیتا تھا تو کوئی جنتر منتر۔ چلے کھینچتے کھینچتے بؔوا کے گھٹنے رہ گئے تھے۔ وظیفے اور تسبیحیں پڑھتے پڑھتے انگلیاں پتھرا گئی تھیں اور سجدہ میں پڑے پڑے پیشانی کا گٹا کچھ زیادہ ہی کجلا گیا تھا۔ ایک زمانہ میں رحیمؔن نائن کے سمجھانے پر کہ ہو نہ ہو کسی بدذات ظالم نے اچھؔے میاں کے حسن پر ریجھ کر انہیں قابو میں کرنے کے لئے انہیں اُلو کا گوشت کھلا دیا تھا، حمیدؔہ بوا نے جانے کتنی جمعراتوں کی شامیں سید بؔابا کے مزار پر چراغ جلانے اور منتیں مانگتے گذار دی تھیں۔ لیکن اچھؔے میاں کو رتی بھر بھی فائدہ نہیں ہوا تھا!

اِدھر پچھلے تین ہفتوں سے وہ مچھلی بازار کی مسجد کے بڑے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضری دے رہی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ حمیدؔہ بوا کا دل مولی ساؔب کی تشخیص پر جم سا گیا تھا۔ مولؔی ساب نے نوچندی جمعرات کو اچھؔے میاں کی خاطر ایک جلالی (اور اسی مناسبت سے مہنگا!) چلہ کھینچنے کے بعد اعلان کیا تھا کہ اچھؔے میاں پر جنات کا بدشاہ آتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے وظیفہ، تعویز اور تسبیح کا پورا کورس تجویز کیا تھا اور ہر ہفتہ اپنے پاس خصوصی توجہ کے لئے حاضری کا حکم بھی دیا تھا۔ حمیدؔہ بوا اس تشخیص سے مطمئن نظر آتی تھیں۔ اور بھلا کیوں مطمئن نہ ہوتیں؟ ایک تو دَوروں کی شکل ہی ایسی تھی۔ دوسرے بؔوا کو معلوم تھا کہ اچھؔے میاں مدتوں چوراہہ کی مسجد کے امام مولوی محمد حسیؔن صدیقی الوارثی صاحب کے پاس جاتے رہے تھے۔ اور دنیا کو علم تھا کہ امام صاحب کے قبضہ میں جنوں کا پورا ایک گروہ تھا جو ان کی خدمت میں صبح و شام لگا رہتا تھا۔ مسجد کے خادم کلّو پہلوان اپنی کبھی کی گذری جوانی کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ ایک جِن دوپہر کے قیلولہ کے وقت امام صاحب کے پیر دابتا تھا۔ چونکہ یہ اس کا آنکھوں دیکھا معاملہ تھا چنانچہ اس میں بؔوا کو شک و شبہ کی

کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ جنات کا بادشاہ بڑے مولی سابؔ کے روحانی علان سے ہی جائے گا۔

اچھےؔ میاں کو آج پھر دَورہ پڑا تھا اور وہ آنگن میں چارپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ سرہانے حمیدہؔ بوا دوپٹہ سے آنسو پوچھتی اور دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگتی خاموش بیٹھی تھیں۔ اِدھر اُدھر اچھےؔ میاں کی بہنیں اور پڑوس کے دو چار ہمدرد لوگ کھڑے تھے۔ یہ سب بار بار کی مشق کے بعد اپنے اپنے کام کے عادی ہو چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے کہ دورہ کے بیچ میں اچھےؔ میاں کو چوٹ پھیٹ سے محفوظ رکھیں۔

یہ دورے بھی عجیب قسم کے تھے۔ بازار میں یا دوستوں کے ساتھ تفریح بازی کے وقت کبھی نہیں پڑتے تھے۔ عام طور سے گھر میں ہی اچھےؔ میاں ان کا شکار ہوا کرتے تھے۔ بَس وہ دو چار لمبے لمبے سانس لیتے اور لیٹ جاتے۔ بظاہر وہ آنکھیں بند کئے بے ہوش نظر آتے تھے۔ سانس کی دھونکنی شوں شاں، شوں شاں چلتی ہوتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں سارے بدن میں کپکپاہٹ کی لہر سی دوڑ جاتی اور وہ ہاتھ پیر اکڑا کر بڑے درد سے کراہتے۔ رہ رہ کر ہاتھ پیر اِدھر اُدھر مارتے پٹختے۔ شروع شروع میں چارپائی کی پٹیوں پر ہاتھ لگنے سے ایسی چوٹیں بھی آئیں کہ کئی کئی دن نیل پڑے رہے اور حمیدہؔ بوا ہلدی چونا لگاتی رہیں۔ اب لوگ ہوشیار ہو گئے تھے۔ جیسے ہی دورہ شروع ہوتا اچھےؔ میاں کے اِرد گِرد رضائی اہر کمبلوں کی گدیاں بنا کر رکھ دیتے کہ ہاتھ پیر محفوظ رہیں۔ پہلے پہل لوگوں نے ان کے بے قابو ہاتھ پیروں کو تھامنے کی کوشش کی تھی مگر دوروں میں خدا جانے ان میں کہاں کی طاقت آ جاتی تھی کہ دو چار لوگ انہیں سنبھال بھی نہیں سکتے تھے۔ کسی کا ہاتھ اگر وہ پکڑ لیتے تو پھر وہ اسی وقت چھوٹتا جب اچھےؔ میاں اپنی گرفت ڈھیلی کرتے اور بعد میں وہ شخص دو تین دن اپنی کلائی سہلایا کرتا۔ ایک مرتبہ تو اچھےؔ میاں نے چارپائی کی پائنتی کی رسیوں میں اپنے پیروں کے پنجے پھنسا کر جوز ور لگایا تو سارے بان تڑ تڑ ٹوٹ گئے تھے۔

آج بھی ہمیشہ کی طرح لوگ صبر سے دورہ ختم کرنے کا انتظار کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد اچھےؔ میاں نے گہری گہری سانسیں لیں، آنکھیں ذرا کی ذرا کھولیں اور پھر کروٹ لے کر دوبارہ بند کر لیں۔ لوگ آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کھسک گئے۔ چھوٹی بہن شاکرؔہ بھاگ کر باورچی خانہ سے گرم دودھ کا پیالہ لے آئی اور حمیدہؔ بوا نے کانپتے ہاتھوں سے چمچہ چمچہ دودھ اچھےؔ میاں کے منہ میں دیا۔ دو تین چمچے لے کر انہوں نے نقاہت سے ہاتھ کا اشارہ کر کے منع کر دیا اور تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دورہ ختم ہو چکا تھا مگر حمیدہؔ بوا اسی طرح سرہانے بیٹھی دوپٹہ کے آنچل سے اچھےؔ میاں کو پنکھا جھل رہی تھیں اور معلوم نہیں سر جھکائے کیا سوچ رہی تھیں۔

وقت یوں ہی گذرتا رہا اور حمیدہؔ بوا کی مایوسی میں تلخی کا رنگ بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات رنج اور غصہ میں وہ جنات کے بادشاہ سے بھی لڑنے مرنے پر تُل جاتی تھیں:

''کم بخت، مَوت کا لِیا! کوئی اور گھر نہیں ملا اس کو؟ میرے بچے کی جان بیران کر رکھی ہے۔ ڈھیٹ بھی تو کیسا ہے۔ بڑے مولیؔ ساب سے چومُکھی لڑے جاتا ہے۔ یا میرے مولا! قیامت کے دن اس کم بخت کا منھ کالا کریو!'' وہ جنات کے بادشاہ کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستیں۔

فکنؔ بی ان کی اس عادت سے بہت گھبراتی تھیں۔ کوسنے سن کر کانپ جاتیں: ''اے بوا! خدا کے واسطے خاموش ہو جاؤ۔ سن لے گا تو کوئی اور مصیبت نہ آ جائے۔ جنات کا بادشاہ ہے، کوئی معمولی جِن تھوڑی ہے۔ تمہیں ستانے لگے گا تو یہ گھر کون دیکھے گا؟ جوان بچیوں کا ساتھ ہے!''

مگر حمیدہؔ بوا پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اچھےؔ میاں کی صحت کے لئے ہر قربانی کو تیار تھیں۔ ابھی پرسوں ہی رام دُلاریؔ منہارن آئی تھی اور سب کی نظریں بچا کر حمیدہؔ بوا کو ایک طرف راز داری سے لے گئی تھی۔ پھر ان کے ہاتھ میں اخبار کے کاغذ کی ایک پُڑیا تھما دی تھی: ''ہم جانت ہیں تم مسلمان ہو بواجی، مُلا بھیا کا دیکھ کر ہمار من دُکھت ہے۔ ای سائیں باباؔ کے مہا بھوگ کا نَریل ہے۔ بھگوان انتریانی ہے۔ بھیا کہ کھِلائے دیو۔ رام بھلی کرے گا۔''

اور حمیدہؔ بوا نے اللہ اور بھگوان رامؔ کا فرق بالائے طاق رکھ کر دوسرے ہی دن چنے کی دال کے حلوے میں ملا کر سائیں بابا کے مہا بھوگ کا ناریل اچھےؔ میاں کو کھلا دیا تھا۔ مگر تعویز اور وظیفوں کی طرح انتریانی بھگوان کا پرساد بھی بے اثر ثابت ہوا تھا۔

اچھےؔ میاں ماشاءاللہ جوان تھے۔ چار بہنوں میں ایک بھائی تھے۔ دوروں کا چکر نہ ہوتا تو حمیدہؔ بوا کب کی گھر میں بہو لے آئی ہوتیں۔ اب بھی برابر اسی فکر میں رہتی تھیں کہ کسی طرح اچھےؔ میاں کا گھر آباد ہو جائے۔ مگر جو شخص بھی دوروں کی خبر سنتا بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹا لیتا۔ فکنؔ بی کو بھی بڑی خلش تھی۔ ایک شام بواؔ سے ملنے آئیں تو اچھےؔ میاں کے رشتہ کا ذکر لے بیٹھیں۔

حمیدہؔ بوا کے پاندان سے بنارسی پان کا مصالحہ دار بیڑا اکلے میں دب کر اپنے مخصوص ہمدردانہ لہجہ میں بولیں: ''اے بوا! اب تم اچھےؔ میاں کا گھر بسا لو، انتظار کاہے کا ہے؟

کیا بیٹے کو بوڑھا کر دینے کا ارادہ ہے؟ بہو آئے گی تو گھر میں رونق ہو جائے گی۔''

''اے بہن! کیا میں نہیں سمجھتی کہ لڑکے کی عمر جا رہی ہے؟ کون سی ماں ہوگی جسے دلہن لانے کا ارمان نہیں ہوگا؟'' بوؔا کی آنکھوں میں آنسو چمک آئے تھے۔''پر کیا کروں، وہ آفت بیٹا جنات کا بادشاہ جو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوا ہے! دنیا بھر میں دوروں کی خبر ہے۔ جدھر جاؤں ہوں لوگ دوسری طرف منھ کر لیوے ہیں۔''

فکنؔ بی ذرا سا آگے کھسک کر بیٹھ گئیں اور اپنا انگوٹھیوں سے لدا پھندا ہاتھ حمیدؔہ بوا کے گھٹنے پر رکھ کر بولیں: ''بوا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ہلکان کیوں ہوتی ہو؟ وہ قاضی پاڑے میں حافظ عبدالسلاؔم جو رہتے ہیں، ارے وہی جن کا پہاڑ سا پریس بڑے بازار میں ہے، تم کہو تو ان کی بیٹی کا معلوم کروں؟ ہر طرح سے اچھی ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہے۔ بس عمر میں اچھؔے میاں سے سال دو سال ہی بڑی ہے۔ تو یہ تو کوئی عیب نہیں ہے۔ کہو کیا کہتی ہو؟''

پھر ہوا یوں کہ اِدھر حمیدؔہ بوا نے حاجی جی کو راضی کیا اور اُدھر فکنؔ بی نے برسوں کی رفاقت کا حق ادا کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پیسہ یوں بھی لاکھوں عیب چھپا لیتا ہے۔ بڑے مولی ساؔب کا روحانی علاج چل ہی رہا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ جنات کا بادشاہ اب کمزور معلوم ہوتا تھا۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ آخر کب تک وہ سامنے ٹکا رہے گا؟ حافظ عبدالسلاؔم کے گھر سے رشتہ کی رضامندی کا آنا تھا کہ حمیدؔہ بوا نے شادی کی تیاری میں تجوری کا منھ کھول دیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسی شاندار شادی انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کیا چڑھاوا، کیا بارات، بوؔا نے پیسہ دل کھول کر خرچ کیا۔ ولیمہ کا چرچا تو دو چار محلوں میں عرصہ تک رہا۔ دلھن بھی گھر سے کچھ کم نہیں لے کر آئی تھی۔ حمیدؔہ بوا اسے ہر وقت ہاتھوں ہاتھ رکھتی تھیں۔ جہاں اس کا پیر پڑتا وہاں اپنا دل نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ اچھؔے میاں بھی زیادہ وقت اپنے کمرہ میں ہی گذارتے تھے۔ کھانا بھی بیشتر وہ دلھن کے ساتھ اندر ہی کھاتے۔ باہر آتے بھی تو جیسے اوپری دِل سے۔ جتنی دیر بیٹھتے بس رسیاں تُڑواتے رہتے تھے۔ باہر دوستوں میں جانا بھی کم ہو گیا تھا اور جاتے تو واپسی میں کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ کبھی گلاب جامن اور رس ملائی کا ڈونگا ہاتھ میں ہوتا تو کبھی ربڑی کا گلاس۔ سیدھے کمرہ میں جاتے اور پھر دیر سے ہی باہر آتے۔ کبھی کبھی منھ جھوٹا کرنے کو تھوڑی سی مٹھائی شاکرؔہ کے ہاتھ پر بھی رکھ دیتے اور بس!

شروع شروع میں تو حمیدؔہ بوا نے اچھؔے میاں کی اس تبدیلی کو نئی شادی اور نئی ارمانوں کا اثر سمجھ کر دل کو بہلا لیا مگر جلد ہی انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ اچھؔے میاں اب پہلے سے سعادتمند اچھؔے میاں نہیں رہ گئے تھے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ جہاں حمیدؔہ بوا ہمیشہ کی طرح گھر کے معاملات میں سو فیصد عمل دخل رکھتی تھیں وہاں بہو اپنا رسوخ قائم کرنا چاہتی تھی۔ بوؔا چاہتی تھیں کہ سینما، تفریح اور خریداری وغیرہ سب دلھن ان کی اجازت اور ایما سے کرے اور بہو تھی کہ اچھؔے میاں کی زبان سے ان پابندیوں پر احتجاج کرتی تھی۔ گھر کا سارا خرچ ہمیشہ حمیدؔہ بوا کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔ اب چاند بیگؔم اس اختیار میں دخیل ہونے پر اُتارو ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہی روایتی قصے اور جھگڑے ساس بہو میں شروع ہو گئے جن سے ہر گھر پُر رونق اور پڑوسیوں کی دلچسپی اور ہنسی کا نشانہ رہتا ہے۔ حمیدؔہ بوا کا اختیار ہوتا تو بہو سے چاندؔ بیگم کا لقب چھین لیتیں جو انہوں نے رونمائی پر ہیرے کے جڑاؤ سیٹ کے ساتھ بڑے چاؤ سے دیا تھا۔ جہاں پہلے وہ سب سے ہنس ہنس کر دلہن کی خوبصورتی اور سگھڑاپے کے فرضی قصے سناتی تھیں وہاں اب اس کے نخریلو مزاج اور پھوہڑپن کی اتنی ہی فرضی کہانیاں سنا سنا کر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی تھیں۔

اچھؔے میاں شروع شروع میں تو ساس بہو کے اس جھگڑے میں غیر جانبدار سے رہے۔ پھر امؔی جان کا مستقل رونا گانا کانوں کو برا لگنے لگا۔ جب چاندؔ بیگم نے کٹورہ سی آنکھوں میں بے گناہی اور معصومیت کے آنسو بھر کر اور بستر پکڑ کر انسٹ پاٹی لی اور ان کی طنابیں کسیں تو اول اول دبی زبان سے اور کچھ ہی دنوں میں کھلم کھلا دلہن کی طرفداری پر آ گئے، گویا بقول حمیدؔہ بوا ''سارے کرم پورے ہو گئے!''

اُس دن فکنؔ بی جو حمیدؔہ بوا سے ملنے آئیں تو انہیں اپنے کمرہ میں پلنگ پر لیٹے خاموش دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ ویسے بھی چونکہ شادی انہیں کی تحریک پر ہوئی تھی فکنؔ بی حمیدؔہ بوا کی مصیبت کا خود کو تھوڑا بہت ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ ان کی اس شرافت پر حمیدؔہ بوا انہیں اپنے ہاتھ سے بنارسی پان بنا کر کھلاتی تھیں اور رخصت کے وقت چنے کی دال کا حلوہ ساتھ کر دیتی تھیں جو فکنؔ بی تھوڑا سا ''نہیں، نہیں!'' کر کے دوپٹہ کے پلو سے ڈھک لیتی تھیں۔

حمیدؔہ بوا کو فکرمند دیکھ کر فکنؔ بی نے پاندان خود ہی اپنی طرف کھینچ کر پوچھا: ''کیا بات ہے بوا، بڑی دُگدھا میں نظر آ رہی ہو آج؟''

حمیدؔہ بوا نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا: ''ارے بی بی! روز روز کیا ایک ہی دُکھڑا روؤں؟ میرے تو گھر کی کایا ہی پلٹ گئی۔ سوچتی تھی کہ بہو آ کر گھر سنبھالے گی اور میں اللہ اللہ کروں گی۔ سو اُس نے تو آ کر بالکل ہی لُٹیا ڈُبو دی۔''

فکنؔ بی نے ایک پان بوؔا کی طرف بڑھا کر اور ایک اپنے کلّے میں دبا کر کہا: ''ہاں بوا، مُوا زمانہ ہی خراب آ گیا ہے۔ بیسویں صدی ہی آخر! جو کچھ ہو تھوڑا ہی ہے۔

سارے قیامت کے آثار ہیں، اور کیا! تم اچھےؔ میاں کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو؟'' اُنہوں نے پُچ سے اگالدان میں پیک کی پچکاری ماری۔

''ارے سمجھاؤں میں کیا خاک؟ وہ میری کوئی بات سنے بھی تو سہی۔ جانے موئی نے میرے بیٹے پر کیا جادو کر دیا ہے کہ اُلو کا گوشت کھلا دیا ہے، اُس کی تو مت اکدم ہی ماری گئی ہے۔ ہماری بھی شادی ہوئی تھی لیکن یہ قیامت تھوڑی ٹوٹی تھی۔'' حمیدہؔ بوا نے کہا۔

''اے ہے بواؔ، اب ایسی بھی کیا مصیبت ہے! میں تو کہوں ہوں کہ یہ آئے دن اُلٹی سیدھی فلم دیکھ کر لڑکے لڑکیوں کا یہ حال ہو رہا ہے۔ نہ شرم رہی اور نہ غیرت۔ بیوی نہ ہوئی نعوذ باللہ خدا ہو گئی!'' فکنؔ بی کو اچھےؔ میاں اور چاندؔ بیگم کی آزادروی میں قیامت کے سارے آثار نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اللہ پاک اپنے رسول ﷺ کے صدقہ میں اچھےؔ میاں کو سمجھ دے۔ تم گھبراؤ مت بواؔ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ ویسے اب اچھےؔ میاں کے دوروں کا کیا حال ہے۔؟''

حمیدہؔ بوا کے سروتہ پر کٹا کٹ چلتے ہوئے ہاتھ یک لخت رُک گئے! ان کا منھ پان چباتے چباتے اَدھ کُھلا رہ گیا تھا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے وحشت زدہ سی فکنؔ بی کو گھورے جا رہی تھیں۔ فکنؔ بی ان کی یہ حالت دیکھ کر کچھ سٹپٹا سی گئیں اور حمیدہؔ بوا کا ہاتھ ہلا کر ڈرتے ڈرتے بولیں: ''اے بوا! کیا بات ہے؟ اچھےؔ میاں اب سے دور ٹھیک ٹھاک خیریت سے تو ہیں نا؟''

حمیدہؔ بوا نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور پھر ادھ مری سی آواز میں جواب دیا:

''خیریت؟ ہاں ہاں سب خیریت ہی ہے۔ اے ہے! بی بی، میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم نے یاد دِلایا تو اب خیال آیا کہ جس دن سے اللہ ماری پچھل پائی بہو نے اِس گھر میں قدم رکھا ہے، وہ کم بخت جنات کا بادشاہ ایسا غائب ہوا ہے کہ پھر لوٹ کر ہی نہیں آیا!!''

شُدھی

(اپنے دھرم سے نکلے ہوئے شخص کو ہندو دھرم میں واپس لانے کے لئے جو مذہبی رسم ادا کی جاتی ہے اُس کو شُدھی یعنی شُدھ یا پاک کرنا کہتے ہیں)

پنڈت سدانؔند شاستری جی نے مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے کچھ سوچ کر جو زور سے ''ہوں ں ں'' کی تو ان کی وقت سے پہلے سفید ہوئی بڑی سی لہریا مونچھ تھرتھرا کر رہ گئی اور رام چندؔر پانڈے بھی اس ''ہوں ں ں'' کی گمبھیرتا پر چونک پڑے! ویسے یہ مونچھ پنڈت جؔی کے سرخ وسفید گول چہرے پر سیاہ چمک دار آنکھوں کے درمیان خوب سجتی تھی۔ پنڈت سدانؔند شاستری جی نکلتے قد، دُہرے بدن اور چوڑی ہاڑ کے وجیہہ آدمی تھے۔ کُھلتا ہوا رنگ، گُھٹے ہوئے سر پر اصلی چنبیلی کے تیل کی چمک، آنکھوں پر سنہری کمانی کا گول شیشوں والا چشمہ اور ماتھے پر انگلی بھر موٹا ترسول دار چندن کا تلک اُن کی شخصیت کو دلچسپ اور رعب دار بناتے تھے۔ بدن پر ہمیشہ گیروے کھدر کا گُھٹنوں تک کا کُرتا اور اس پر سفید کھدر کی خالص بنارسی ڈھنگ کی دھوتی پہنے رہتے تھے۔ پیروں میں کھونٹی دار کھڑاؤں اور گلے میں بڑے سے منکوں کی مالا پہن کر جب وہ کھٹ کھٹ کرتے گذرتے تو لوگ دور سے آواز سن کر نمسکار کرنے اور آشیرواد لینے کو کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

پنڈت جؔی سائیں بابا مندر کے پجاری تھے۔ رامائن پاٹھ اور ستیہ نارائن کتھا کے لئے دور دور تک مشہور تھے۔ گیانی آدمی تھے مگر غرور چھو کر بھی پاس سے نہیں گذرا تھا۔ ہر ایک سے پریم اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور زیادہ وقت پوجا پاٹھ اور لوگوں کی سیوا میں ہی گذارتے تھے۔ دل کے بہت نرم اور زبان کے اتنے ہی میٹھے تھے چنانچہ کیا چھوٹا اور کا بڑا سب ہی ان سے پیار اور محبت کا سلوک کرتا تھا۔ پنڈت جؔی اس علاقہ کی دھارمک سنستھا کے پرمکھ چالک بھی تھے اور اس وقت وہ دہ اور ممبروں کے ساتھ رام چندؔر پانڈے کے برآمدہ میں مونڈھوں پر بیٹھے اس گمبھیر مسئلہ پر سوچ بچار کر رہے تھے جس نے پچھلے چند مہینوں سے محلّہ کی بہت سی بے لگام زبانوں کو آزادی سے دوسروں پر الزام لگانے اور دھرم کی سخت خطرہ میں گرفتاری کا اعلان کرنے کا موقع فراہم کر رکھا تھا۔

اُن کے دوسرے ساتھی لالہ سری پت رامؔ تھے جو چوک میں بھوسہ اور جلَونی لکڑی کی آڑھت کا کام کرتے کرتے سٹھیا سے گئے تھے۔ سیاہ رنگ، چھوٹے قد اور گول مٹول بدن کے لالہ جی ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ لڑکے ان کو سرپٹ رامؔ کہہ کر چراتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ برا مان کر غصہ میں گالی دے لیا کرتے تھے، مگر اب اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ چھوٹے بڑے سب انہیں سرپٹ رامؔ کا کا کے نام سے ہی بلاتے تھے اور وہ ذرا بھی برا نہیں مانتے تھے۔ اِس وقت وہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کہ پیالی میں چونا اور دیسی تمباکو کی چنیوٹی انگوٹھے سے کھسر کھسر گھس رہے تھے جیسے تمام مقدمہ ان کی سمجھ میں آ رہا ہو، ورنہ واقعہ یہ تھا کہ لکڑی اور بھوسے کی آڑھت کے علاوہ بیشتر باتیں ان کے کھچڑی سر کے اوپر سے یوں ہی گذر جاتی تھیں۔

مول چندؔر سریواستو اس تکون کا تیسرا کونہ تھے۔ وہ قریب کی کاٹن مل میں کلرک تھے۔ پوجا پاٹھ اور ساتھ ہی لیڈری کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ مندر کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ہولی، دیوالی، رام نومی سے لے کر رام لیلا اور دسہرا تک مندر سجانے، پوجا کروانے اور پرساد بانٹنے اور کھانے میں نہایت چوکس تھے۔ اُنہیں لیڈری کے شوق کی بدولت دوسرے کے پھٹے میں پاؤں اَڑانے کا لپکا ہو گیا تھا۔ خود چونکہ دھرم گیان سے کورے تھے، پنڈت سدانؔند جی کی چھتر چھایا میں ڈیرہ ڈالے رہتے تھے اور ان کے مضبوط کندھے پر رکھ کر اپنی کمزور سی بندوق چلانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ پنڈت جی بھی اپنی سادہ دلی اور اِن کی طلب کے تقاضہ پر انہیں اکثر ساتھ لے لیتے تھے۔

سرپٹ کا کا نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہتھیلی پر دو چار تھپکی دے کر فاضل چونا اڑایا اور پھر تمباکو نچلے ہونٹ کے پیچھے رکھ کر بولے: ''پانڈےؔ جی! ای ماملہ بہوت گمبھیر ہے بھائی۔ سارا محلّہ تُہار کھلاپ ہوئی گوا ہے۔ لوگ بائیکاٹ پر اُتارو ہیں بائیکاٹ پر! پنڈت جی مہاراج بھی کا کریں؟ کو نو بات سننے کو تیار نا ہیں ہے۔ دھرم شاستر سے کون جو کھم لے سکت ہے بھیا؟'' سرپٹ کا کا نے یہاں پہنچ کر دونوں کانوں پر ہاتھ دھر کر اپنی چندھی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا دیں۔

پانڈے جی بائیکاٹ کا سن کر گھبرا گئے۔ ویسے ہی وہ ان لوگوں کی مسلسل جرح سے بے حال ہو رہے تھے۔ اب بائیکاٹ کی دھمکی سنی تو اور دل پریشان ہو گیا۔ کمرہ میں

کھلنے والے کواڑ کے پیچھے سے اچانک آنے والی چوڑیوں کی کھنک نے ان کو چونکا دیا۔ بسنتیؔ آڑ میں بیٹھی چندؔا کو دودھ پلا رہی تھی اور اس نئی مصیبت نے شاید اس کو پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پانڈے جیؔ ابھی جواب سوچ ہی رہے تھے کہ سریواستو جیؔ نے وار کیا: ''سنا ہے کہ آپ نے اپنی بیٹی کا نام چاند سلطانہؔ رکھا ہے؟ یہ کیسا مسلمانی نام رکھا آپ نے؟''

پانڈے جیؔ سنبھل کر بولے: ''ہماری بیٹی کا نام چندر مادیویؔ ہے۔ رمجانیؔ بابو کی پتنی اسے چاند سلطانہؔ کہتی ہیں۔ ویسے سب لوگ اسے پیار سے چندؔا بُلاتے ہیں۔ اس میں کون سی ایسی بری بات ہے؟'' ان کا لہجہ کچھ گرم ہو چلا تھا۔ انہیں سماج کے ان ٹھیکہ داروں پر اب غصہ آ رہا تھا جو کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتے تھے۔

سریواستو جیؔ نے پنڈت سدانندؔ جی کی طرف مسکرا کر دیکھا مگر وہاں سے جوابی مسکراہٹ نہ ملنے پر کچھ کھسیا سے گئے۔ اپنی ٹھوڑی پر بڑی سنجیدگی سے ہاتھ پھیر کر انہوں نے بڑے فاتحانہ انداز میں پوچھا: ''چلیں، بیٹی کا نام ہم چندرؔ مادیوی مانے لیتے ہیں۔ پرنتو ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ رمجانیؔ بابو کی پتنی کا دودھ بھی پیتی ہے۔ ہے رام! یہ تو بالکل دھرم بھرشٹ کرنے والی بات ہے۔''

سریواستو جیؔ کے اس سوال پر پانڈے جیؔ بکھر ہی تو گئے۔ ان کے سیدھے سادے، انسان دوست ذہن میں دھرم، ادھرم، نشٹ، بھرشٹ کی الجھنیں کب تھیں جو اس نامعقول جرح کی باریکیوں کو وہ سمجھتے۔ اور اگر سمجھ بھی لیتے تو وہ انہیں مان لینے کو کب تیار تھے؟ انہوں نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا:

''سریواستو جیؔ! آپ سب کو معلوم ہے کہ چندؔا کیسے رمجانیؔ بھائی کے گھر پل رہی ہے اور ان کی بیٹی انجمؔ ہمارے گھر کیسے رہتی ہے۔ یہ بھگوان کی دیا ہے کہ دونوں بچیاں بسنتیؔ اور سلمہؔ دیدی کو اپنی مائیں سمجھتی ہیں۔ بھوک لگنے پر جو بچی جہاں ہوتی ہے وہیں دودھ پی لیتی ہے۔ نہ انجمؔ میری پتنی کا دودھ پی کر ہندو ہوتی ہے اور نہ ہی چندؔا رمجانیؔ بھائی کی بیوی کا دودھ پی کر مسلمان! آپ لوگوں کو وہ پریم اور بھائی چارہ کیوں نہیں دکھائی دیتا ہے جو ان گھروں میں ہے؟ یہ جھگڑا کھڑا کرنے سے آپ لوگوں کو کیا ملے گا؟''

پنڈت سدانندؔ جی نے مناسب سمجھا کہ اب معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ وہ اس بحث اور صورت حال سے خوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک طرف ان کے دل کی نرمی اور محبت تھی جو اس مسئلہ سے چشم پوشی کر کے پانڈے جیؔ کو ان کے حال پر چھوڑ دینے پر اُکسا رہی تھی اور دوسری جانب اُن کا دھرم گیان، مندر میں ان کا مقام اور سماج کے تقاضے تھے جن کے نزدیک رواداری اور دردمندی سے زیادہ اہم وہ بے لچک اور عقل سے کورے قانون تھے جو ہزاروں سال پہلے کسی شخص نے لکھ دئے تھے اور جن پر بے سوچے سمجھے عمل کرنا لوگوں نے دھرم بنا رکھا تھا۔

وہ رام چندرؔ پانڈے سے مخاطب ہوئے تو ان کے چہرہ اور آواز سے ان کے دل کا درد اور ان کی مجبوری صاف ظاہر ہو رہی تھی: ''پانڈے جیؔ! آپ جو کہہ رہے ہیں وہ انسانیت کے ناطے ٹھیک معلوم ہوتا ہے مگر محلّہ کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس طرح کا سمبندھ عام ہو گیا تو آگے چل کر ہندو مسلمان آپس میں شادی بیاہ کرنے لگیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں آپ کا یا کسی اور کا دشمن نہیں ہوں۔ پر کیا کروں، جو شاستروں میں لکھا ہے اس کو توڑ نہیں سکتا ہوں۔ آپ ہندو ہیں اور پھر برہمن! آپ کی بچی مسلمان گھر میں پل رہی ہے، مسلمان استری کا دودھ پیتی ہے اور معلوم نہیں کیا کیا اس کو چکھنے چکھانے کو ملتا ہوگا۔ یہ سب ہندو دھرم بھرشٹ کرنے والی باتیں ہیں۔ دھارمک سنستھا نے اسی لئے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ ہم لوگ آپ کو سمجھائیں اور بچی کو پھر سے ہندو دھرم میں واپس لے آئیں۔''

پانڈے جیؔ نے یہ سوچ کر کہ معاملہ جتنی جلدی نمٹ جائے اچھا ہے لہجہ نرم بنا کر پوچھا: ''تو آپ لوگ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ پنڈت جی! آپ نے اس سمسّیا کا کچھ نہ کچھ راستہ تو نکالا ہی ہوگا؟''

رام چندرؔ پانڈے کو جب رمضان علیؔ بابو کے پڑوس کا مکان ملا تھا تو چند دنوں میں ہی دونوں گھروں میں تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ دونوں سیدھے سادے، دردمند آدمی تھے۔ مذہب اور دھرم کے فرق، ہندو مسلم سیاست اور خواہ مخواہ کے جھگڑوں سے دونوں نفرت کرتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ دونوں کی بیویاں ایسی گھل مل گئیں کہ جو تھوڑی بہت اجنبیت دنیاداری کے تقاضوں سے رہ جاتی وہ بھی نہیں رہی۔ اتنا ضرور ہوا کہ پانڈے جیؔ، رمضان علیؔ کو سب کی طرح رمضانیؔ بھائی تو ضرور کہتے تھے لیکن ان کے گھر کا کھانا پینا ان کی عمر بھر کی ہندو تربیت یافتہ طبیعت گوارا نہیں کرتی تھی۔ رمضان علیؔ اور ان کی بیوی سلمہؔ پانڈے جیؔ اور بسنتیؔ کے اس اصول کا احترام کرتے تھے اور بھول کر بھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لاتے تھے۔ سلمہؔ اور بسنتیؔ کا بیشتر وقت ساتھ ہی گذرتا تھا اور سلمہؔ کا دو سالہ بیٹا انورؔ بسنتیؔ سے ایسا مانوس ہو گیا تھا کہ اس کے گھر جاتا تو اکثر کھا پی کر وہیں سو بھی جاتا تھا۔ بسنتیؔ بھی اسے اپنے بچہ کی طرح چاہتی تھی۔

یوں بسنتیؔ دل کی بڑی دُکھی تھی۔ شادی کو بارہ برس ہو گئے تھے مگر اس کی گود اولاد سے محروم تھی۔ کون سا جتن تھا جو اس نے اولاد حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹروں اور ویدوں کے علاج سے ہار کر پوجا پاٹھ، منت مراد اور تیرتھ یاترا سبھی کچھ تو کر ڈالا تھا۔ ہردوار کی پہاڑیوں کی پتھریلی خاک تک تو وہ چھان آئی تھی مگر بھگوان انتریانی

ہوتے ہوئے بھی اب تک اس پر مہربان نہیں ہوئے تھے۔ سلمہؔ سے دل کا حال کہہ کر اسے سکون سا مل جاتا تھا۔ سلمہؔ بھی اس کو دلاسہ دیتی رہتی تھی:

''بسنتیؔ! مایوس نہ ہو۔ کون سا ایسا وقت نکل گیا ہے؟ بارہ سال ہی تو ہوئے ہیں۔ اللہ کو رحم کرتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔ دیکھ لینا ایک دن تم مجھے خوشخبری سنانے بھاگی بھاگی آؤ گی، ہاں ں!'' اور بسنتیؔ مری سی مسکراہٹ سے سلمہؔ کی بات سن کر خاموش ہو جاتی۔

پھر ایک دن جانے بسنتیؔ کو کیا سوجھی کہ سلمہ سے کہنے لگی: ''دیدیؔ! میں تو سب جتن کر کے ہار گئی۔ نہ ڈاکٹروں سے کچھ ہوتا ہے اور نہ پوجا پاٹھ سے۔ اب تم ہی کچھ کرو نا دیدی! کیا پتہ تمہاری دعا ہی لگ جائے!''

سلمہؔ نے اس کے بھولے پن پر ہنس کر کہا: ''اری پاگل! کیا میں تمہارے لئے دعا نہیں کرتی ہوں؟ اب جب اللہ چاہے گا دعا قبول کرے گا۔ تم دل تھوڑا مت کرو۔ وقت پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مگر بسنتیؔ پیچھے پڑ گئی: ''نہیں دیدیؔ! کچھ کرو۔ میرا کہا مان لو میری دیدی!''

سلمہؔ نے سوچ کر کہا: ''میں کیا کروں بسنتیؔ؟ چلو اگلے جمعہ کو قرآن خوانی رکھے لیتی ہوں۔ پھر سب دعا مانگیں گے۔ اوپر والا بڑا کارساز ہے۔ تم بھی بھگوان پر بھروسہ رکھو۔ جو ہوگا اچھا ہوگا۔''

اور پھر اگلے جمعہ کو رمضانیؔ بابو کے گھر سلمہؔ کی کئی سہیلیوں نے مل کر قرآن ختم کیا۔ برآمدہ میں دریاں بچھا کر اور ان پر سفید چادریں ڈال کر بیٹھک کا انتظام کیا گیا تھا۔ گھر لوبان اور اگربتّی کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور بسنتیؔ ایک کونہ میں سفید ساری سے سر ڈھکے خاموش سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ قرآن خوانی کے بعد جب سلمہؔ نے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالی سے اس کی ویران گود بھرنے کی دعا مانگی تو بسنتیؔ بے اختیار رو پڑی اور دیر تک سلمہؔ کے کندھے سے لگی روتی رہی۔ سلمہؔ نے اپنے دوپٹہ سے اس کے آنسو پوچھے تو دیدیؔ کے بھیگے گال دیکھ کر پھر سسکیاں لے کر سلمہؔ کے شانہ سے لگ گئی۔ اور دونوں مل کر خوب ہی تو روئیں۔ محفل میں خاموشی تھی اور ہر شخص اس منظر سے متاثر نظر آ رہا تھا۔

معلوم نہیں قدرت کن اصولوں پر کام کرتی ہے، کون سی دعا قبول ہوتی ہے اور کون سی نہیں۔ پھر اگر قبول ہوتی ہے تو کیوں ہوتی ہے۔ اللہ یا بھگوان کیسے اس کا فیصلہ کرتا ہے کہ ایک کو بامراد اور دوسرے کو محروم رکھے۔ بہر حال ایک صبح بسنتیؔ بھاگی بھاگی سلمہؔ کے گھر آئی اور اس سے لپٹ کر ایسا بے اختیار روئی کہ سلمہؔ حواس باختہ ہو گئی۔

''ارے کیا ہو گیا بسنتیؔ، کیوں رو رہی ہو؟ بھائی صاحب تو ٹھیک ہیں؟ کوئی بری خبر کہیں سے آئی ہے؟'' وہ گھبرا گھبرا کر پوچھ رہی تھی اور بسنتیؔ کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہچکیاں لیتے لیتے اس نے دیدیؔ کو جب وہ خوشخبری سنائی جس کا بارہ سال سے انتظار تھا تو سلمؔ کی بے اختیار چیخ سی نکل گئی۔

''ارے بسنتیؔ سچ؟ یا اللہ تیرا شکر ہے!''

پھر تو دونوں لپٹ کر ایسا روئیں کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ذرا حواس ٹھکانے آئے تو سلمہؔ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا، پاس رکھی شکر دانی سے شکر کا چمچہ بسنتیؔ کے منھ میں ڈال دیا: ''لے، منھ تو میٹھا کر لے اپنا!'' اور بسنتیؔ نے روتے روتے منھ کھول دیا۔ پھر گھبرا کر سلمہؔ کا منھ حیرت سے تکنے لگی۔ مگر اب تو دیر ہو چکی تھی!

''اے ہے بسنتیؔ! میں بھی باؤلی ہو گئی تھی۔ اپنے گھر کی شکر تجھ کو کھلا دی'' سلمہؔ دیدی گھبرا کر بولیں۔ ''پانڈے جیؔ کو معلوم ہوا تو کیا ہوگا؟ میری بہن ان سے کہنا مت، میں بھی کسی سے نہیں کہوں گی۔''

''چھوڑو دیدیؔ! تم فکر نہ کرو۔ تمہارے بھائی صاحب اتنی سی شکر کھا لینے پر مجھ سے ناراج تھوڑی ہو جائیں گے۔'' بسنتیؔ مسکرا کر بولی۔

''اچھا! تو یوں کہو کہ پانڈے جیؔ کو بس میں کر رکھا ہے!'' سلمہؔ نے ہنس کر چٹکی لی۔ بسنتیؔ جھینپ گئی: ''ہٹو دیدیؔ، تم بھی کیا باتیں کرتی ہو!''

اس ہنسی مذاق میں سلمہؔ اُسے یہ بتانا بھول گئی کہ جس خوشی سے بسنتیؔ آج مالا مال ہوئی تھی، وہی خود اس کے گھر میں انورؔ کے بھائی بہن کی شکل میں جلد ہی آنے والی تھی!

پھر یوں ہوا کہ ہفتہ بھر کے آگے پیچھے سے سلمہؔ اور بسنتیؔ بچیوں کی مائیں بن گئیں۔ تیسرے ہی دن بسنتیؔ اور پانڈے جیؔ بچی کو لے کر رمضان علیؔ کے مکان پر پہنچ گئے، اور پہنچتے ہی بسنتیؔ نے بچی کو سلمہؔ دیدی کی گود میں ڈال دیا۔ رمضانیؔ بابو سوالیہ نظروں سے بسنتیؔ کو دیکھ رہے تھے کہ پانڈے جیؔ نے کہا:

''رمجانیؔ بھائی! یہ بیٹی سلمہؔ دیدی کی دعاؤں کی دین ہے۔ یہ آج سے آپ کی بیٹی ہے۔ اس کا نام آپ ہی رکھئے اور اسے پالئے بھی آپ ہی۔''

رمضان علیؔ نے محبت سے پانڈے جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''بھئی، تمہاری اولاد اور ہماری اولاد سب برابر ہے۔ تمہاری بیٹی ہمیشہ ہماری بیٹی رہے گی۔ مگر یہ نام وام رکھنے اور پالنے والی کیسی بیڈھب بات کر رہے ہو! اللہ تمہاری بیٹی کو عمر دے۔ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔''

ابھی وہ شاید کچھ اور کہتے مگر بسنتی آنکھوں میں آنسو بھرے، ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی:

''بھائی صاحب! آپ کو ہماری بات ماننی ہی پڑے گی۔ یہ بیٹی سلمہ دیدی کہ لینی ہی ہوگی۔::

رمضانی بابو نے بے بسی سے سلمہ کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا: ''رکھ دیجئے نہ نام! ایسی کیا بڑی بات ہے۔''

اب رمضانی بابو بھی موڈ میں آ چکے تھے: ''چلو یوں ہی سہی۔ پانڈے بھائی! بچی کا نام چندر مادیوی رکھ دو۔ جیسی صورت ہے ویسا ہی نام بھی ہونا چاہیے۔''

سلمہ نے چندر مادیوی کا منھ چومتے ہوئے کہا: ''میں تو اسے چاند سلطانہ کہوں گی۔ ہے بھی تو چاند ایسی!''

''ارے اللہ کا شکر ادا کرو کہ بچی ماں پر گئی ہے۔ خدانخواستہ باپ پر جاتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔'' رمضان علی نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

ان کے اس مذاق پر رام چندر پانڈے بھی بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر سلمہ کی طرف کچھ بھیگی بھیگی آنکھوں سے دیکھ کر بولے: ''دیدی، دو دو بیٹیاں لے کر بھی کیا آج منھ میٹھا نہیں کراؤ گی؟''

سلمہ ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ پانڈے جی جو ان کے گھر کے گلاس میں خود اپنے گھر کا پانی پیتے ہوئے جھجھکا کرتے تھے آج ان سے مٹھائی مانگ رہے تھے۔ جلدی سے بھاگ کر باورچی خانہ سے پلیٹ میں تل کے لڈّو سجا لائیں۔ ایسی خوشی کا تو تصور بھی ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہوگا جو اس دن دونوں گھروں میں منائی گئی۔

پنڈت جی نے پانڈے جی کا سوال سن کر ایک مرتبہ انہیں بڑی گہری اور گمبھیر نظروں سے دیکھا۔ پھر آنکھیں معلوم نہیں کیوں نیچی کر لیں اور بہت دھیمی آواز میں بولے:

''شاستروں میں لکھا ہے کہ آپ کی بیٹی کی شدھی ہونی چاہئے۔''

سریواستو جی نے پنڈت جی کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے جلدی سے فرش پر رکھی، برگد کے پتّے سے ڈھکی ہوئی پیتل کی لُٹیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اور شدھی کے لئے ہم گئو موتر ساتھ ہی لے کر آئے ہیں۔''

''گئو موتر!!'' پانڈے جی کی چیخ نکل گئی۔ ''آپ ہماری بیٹی کو گئو موتر پلائیں گے؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ پنڈت جی؟'' غم و غصہ سے ان کا رنگ بدل گیا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پنڈت جی کی خاموشی دیکھ کر سر پٹ کا کا تو صرف سر ہلا کر رہ گئے مگر سریواستو جی نے جواب دینا ضروری سمجھا۔

''جب شاستروں کا یہی حکم ہے تو کوئی بھلا کیا کر سکتا ہے؟ پھر گئو موتر تو گئو ماتا کا پوتر وردان ہے۔''

ابھی پانڈے جی اس پوتر وردان پر کچھ بولنے ہی والے تھے کہ کمرہ کا دروازہ کھلا اور گود میں سوئی ہوئی بچی کو لئے بسنتی اُتر کر برآمدہ میں آ گئی۔ وہ محلّہ کے مردوں کے درمیان اس سے پہلے ایسی بے باکی سے کبھی نہیں آئی تھی۔ اپنی پریشانی اور غصہ کے باوجود پانڈے جی اس کی ہمت اور حالت دیکھ کر اپنی حیرت پر قابو نہیں رکھ سکے اور منھ کھولے، آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔

بسنتی پر اس وقت عجیب کیفیت کا عالم تھا۔ ساری کا پلّو سر سے ڈھلکا ہوا تھا اور بال بکھر کر پیشانی پر پسینہ سے چپکے ہوئے تھے۔ رنج اور غصہ سے اس کا چمپئی رنگ تانبہ کی طرح دمک رہا تھا۔ دونوں گال سرخ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے تر ہو رہے تھے اور وہ سارے بدن سے کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرہ پر کچھ ایسا جلال تھا کہ پنڈت جی کی نظریں اک مرتبہ ہی اس کی نظروں سے مل کر پھر اُٹھنے کی ہمت نہیں کر سکیں۔

بسنتی نے آگے بڑھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چندا کو پنڈت جی کی گود میں ڈال دیا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا:

''پنڈت جی مہاراج! ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ماں کا دودھ بھی ہندو اور مسلمان ہوتا ہے۔ پلایئے آپ اسے گئو موتر! کریے اس کی شدھی!'' پھر اس کا گلا رندھ گیا اور وہ خاموش ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سب کو ہی سانپ سونگھ گیا ہو۔

پنڈت جی نے نظریں جھکائے جھکائے چندا کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ نیند کے نشہ میں چندا نے آنکھیں آدھی کھولیں اور پنڈت جی کو دیکھ کر پھر بند کر لیں۔ اس کے پھول سے ہونٹوں پر نیند میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے سوتے سوتے دو چار مرتبہ چسر چسر ہونٹ ہلائے اور رال میں ملی ہوئی ابھی ابھی پیئے ہوئے دودھ کی ایک بوند اس کی بانچھ سے نکل کر گال پر سے پھسلتی ہوئی پنڈت جی کے گیروے کُرتے میں جذب ہوگئی۔

پنڈت جی نے ایک گہری سانس لے کر اٹھے اور انہوں نے نہایت آہستگی سے چندا کو پانڈے جی کی گود میں ڈال دے دیا۔ پھر انہوں نے جھک کر گئو موتر کی لُٹیا اٹھائی اور بھاری بھاری قدموں سے باہر کے دروازہ کی طرف آنگن میں چل دئے۔ دروازہ پر پہنچ کر ایک لمحہ کو رکے، جھک کر گئو موتر کی لُٹیا نالی میں پوری کی پوری انڈیل دی اور خالی ہاتھ

دروازہ کھول کر لمبے لمبے قدم بڑھاتے وہ گھر سے باہر نکل گئے۔

اور اُدھر چندرؔما دیوی عرف چاند سلطاؔنہ عرف چندؔا تھی کہ پنڈت سدانؔند شاستری جی کی شدھی سے فارغ ہو کر پانڈے جی کی گود میں بے خبر سو رہی تھی!

لچھمی پوجا

میں اس اتوار ناشتہ سے فارغ ہو کر اخبار دیکھ ہی رہا تھا کہ چپراسی عبدالقادرؔ کی آواز نے مجھے چونکا دیا:

''ہجور! پنڈت بنی پرساؔد سلام کرنے آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں۔''

اتوار کی صبح کسی ٹھیکہ دار کا اس طرح آنا بڑی عجیب سی بات تھی۔ چُھٹّی کا دن تھا چنانچہ کام کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اس کا بھی یقین تھا کہ پنڈت جیؔ مجھ کو ''دستوری'' دینے نہیں آئے تھے جو پی ڈبلو ڈی ڈپارٹمنٹ میں رشوت کا مہذب نام تھا۔ سب جانتے تھے کہ میرا دامن محکمہ کی اس لعنت سے پاک تھا۔ پھر بھلا پنڈت جیؔ مجھ سے اس وقت کیوں ملنا چاہتے تھے؟

میں نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے عبدالقادرؔ سے کہا: ''اچھا، برآمدہ میں دو کُرسیاں ڈال دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

فتحپور ضلع پی ڈبلو ڈی میں میرے تقرر کو صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کر کے میں پچھلے سال ہی نکلا تھا گویا پی ڈبلو ڈی کی دنیا میں نو وارد تھا۔ اس مختصر سی مدت میں ہی رشوت کی گرم بازاری، عملہ کی بدعنوانیاں اور ٹھیکہ داروں کی بے ایمانی دیکھ کر طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ اس محکمہ کی کوئی کل ان روایات اور اقدار کے مطابق نہیں تھی جن کی تعلم و تربیت میرے شریف اور سیدھے سادے والدین نے ہمیشہ دی تھی۔ چنانچہ میں نے پی ڈبلو ڈی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ارادہ شروع ملازمت میں ہی کر لیا تھا اور اِدھر اُدھر نوکری کی تلاش میں تھا۔

پنڈت بنی پرساؔد سے میں خوب واقف تھا۔ میرے علاقہ کے کئی ٹھیکے اُن کے پاس تھے۔ اکثر دفتر میں نظر آ جاتے تھے۔ درمیانہ قد، ورزشی بدن، سانولا رنگ، خوش شکل آدمی تھے۔ چمکتی ہوئی آنکھوں پر گول شیشوں کی کمانی دار عینک لگائے، سفید خم دار مونچھوں کے درمیان مسکراتے ہوئے وہ جب جھک کر نمسکار کرتے تو آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بات چیت بڑی نرم اور سلجھی ہوئی کرتے تھے مگر میں نے غور کیا تھا کہ دفتر میں بڑے بابو رام بہاریؔ سے لے کر بھگوان داسؔ چپراسی تک ہر شخص پنڈت جیؔ سے سنبھل کر بات کرتا تھا بلکہ کچھ ڈرا ڈرا سا نظر آتا تھا۔ میرے سوال پر کہ: ''علاقہ کے اکثر بڑے ٹھیکے آخر اُن کے پاس ہی کیوں تھے؟'' رام بہاریؔ بابو بڑی سنجیدگی سے سمجھانے والے انداز میں جواب دیتے کہ: ''صاحب! یہ پرانے ٹھیکہ دار ہیں۔ دام لگانا اور کام کرنا خوب جانتے ہیں۔ اِس طرف ان کی ٹکر کا کوئی اور ٹھیکہ دار نہیں ہے۔''

میں کمرہ سے نکل کر برآمدہ میں آیا تو پنڈت جیؔ نے کرسی سے اٹھ کر ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا، اور میری دعوت پر پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سے سنجیدگی اور پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

میں نے پوچھا: ''کہئے پنڈت جیؔ! سویرے سویرے آج کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

پنڈت جیؔ نے دھوتی کے پلو سے پسینہ پوچھتے ہوئے جواب دیا: ''ہجور! کیا بتائیں۔ آپ نے تو بڑا گجب کر دیا۔ ہمارے اوپر بھٹوؔرا روڈ کے کام پر جرمانہ کر دیا۔ صاحب آج تک کسے نے ایسا نہیں کیا۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔''

اُن کی اس بات پر مجھ کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میرے فیصلہ پر کہنے کی ہمت، وہ بھی اتوار کی صبح ایسے لب و لہجہ میں، انہیں ہوئی تو کیسے ہوئی؟ میں نے ذرا تیزی سے کہا: ''پنڈت جیؔ! اس میں غضب کی کون سی بات ہے؟ پچھلے ہفتہ بھٹوؔرا روڈ کے دورہ پر کنکر کی چُنائی دیکھی تھی۔ آپ ایسی ہی چُنائی کراتے ہیں کیا؟ اس کے بعد سڑک کتنے دن چلے گی؟ دیکھئے! میرا علاقہ میں ایسے کام نہیں ہوگا۔ اگر کام غلط ہوگا تو جرمانہ بھی ہوگا۔ غضب تو آپ کر رہے ہیں پنڈت جیؔ، میں تو صرف کام صحیح کرانا چاہتا ہوں!''

پنڈت جیؔ میری تقریر اطمینان سے سنتے رہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو! پھر ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے بولے: ''ہجُورؔ! آپ نئے نئے آئے ہیں۔ آپ کو کھبر نہیں ہے کہ یہ ٹھیکہ ٹھاکر جگراج سنگھؔ جی کا ہے! ہمارا تو سرپھ کا گج پر نام لکھا ہوا ہے۔ اس اِلاکہ میں ٹھاکر صاحب کا راج ہے۔ جیسا وہ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ آپ کو رستوگیؔ بابو اوورسیر نے ساید

نہیں بتایا ہے۔اب ٹھاکر صاحبؔ نے کہلایا ہے کہ انجینئر صاحب سے سمجھا دو کہ جرمانہ واپس لے لیں اور آگے کھیال رکھیں۔''

میں نے ذہن میں بجتی ہوئی خطرہ کی گھنٹی کو افسری کے زعم میں نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا:''یہ ٹھاکر جگراج سنگھؔ جی کون ہیں پنڈت جیؔ؟ اور یہ سمجھانے والی بات بھی خوب رہی۔آپ دھمکی دے رہے ہیں کیا؟''

پنڈت جیؔ نے بڑی نرمی سے کہا:''ارے نہیں صاحب! ہماری ایسی ہمت کہاں؟ پر ٹھاکر صاحبؔ کی بات دوسری ہے۔اُن سے بیر کرنا ٹھیک نہیں ہے ہجور۔پولس بھی ان سے ڈرتی ہے۔جس کو چاہیں مروا دیں، جس کا چاہے گھر جلوا دیں۔ٹھاکرؔ صاحب کو معلوم ہے کہ آپ نئے ہیں، اور انجانے میں جرمانہ لگا دیا ہے۔آپ جرمانہ واپس لے لیں صاحب! ماملہ بڑا گمبھیر ہے۔''

اب میں بری طرح گھبرا چکا تھا۔''ٹھاکرؔ جگراج سنگھ کوئی ڈکیت ہیں کیا؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

پنڈت بنی پرسادؔ مسکرائے:''آپ ایسا ہی سمجھ لیجئے صاحب! دور دور تک ان کی دھاک ہے۔یہاں ان کی مرجی کے کھلاپھ کئی کام نہیں ہوسکتا ہے۔آپ کاہے کو کسی چکر میں پڑتے ہیں۔ہمارا کہنا مان لیجئے اور بس!''

معاملہ اب بڑا نازک ہو چلا تھا، اور میری ناتجربہ کاری اس نزاکت کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی۔جرمانہ تو میں اگلے دن واپس لے سکتا تھا لیکن پھر اس کا علم سب دفتر کو ہو جاتا کہ صاحب نے بنی پرسادؔ سے ڈر کر جرمانہ واپس لے لیا ہے۔اور اگر نہ لیتا تو ٹھاکر صاحب معلوم نہیں میرے ساتھ کیا کرتے۔کچھ دیر سوچ کر بڑی ہمت سے نے میں نے پنڈت جیؔ سے کہا:''پنڈت جیؔ! اب تو جرمانہ ہو چکا۔واپس لینے میں میری بڑی بے عزتی ہوگی۔آپ ٹھاکر جگراج سنگھؔ جی سے میری طرف سے کہہ دیجئے گا کہ یہ جرمانہ اسی طرح سے رہے گا۔ہاں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

پنڈت جیؔ میری جانب حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے انہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہو۔آج سے پہلے شاید کسے نے ایسے حماقت کی نمائش نہیں کی تھی۔

انہوں نے پھر سمجھایا:''صاحب! ایسا نہ کیجئے۔آپ کو کھبر نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں!''

میں نے اپنی بات کی پیچ کرتے ہوئے کہا:''آپ ٹھاکر صاحب سے کہہ کر تو دیکھئے، کیا پتہ وہ مان ہی جائیں۔''

کچھ دیر تک اور کوشش کر کے پنڈت بنی پرسادؔ مایوسی اور حیرت سے سر ہلاتے ہوئے دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔وہ سارا دن مجھے اپنی حماقت پر افسوس اور غصہ میں گذرا۔رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ معلوم نہیں ٹھاکر جگراج سنگھؔ کل میری کیا درگت بنائیں گے۔ مگر تیر اب کمان سے نکل چکا تھا اور سوائے انتظار کوئی چارہ نہیں تھا۔

---------(۲)---------

دوسرے دن پنڈت جیؔ کا رکشہ دروازہ پر آ کر رکا تو میں ان کا منتظر ہی تھا۔رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا:''تو پنڈت جیؔ! ٹھاکر صاحب نے کیا جواب دیا؟''

پنڈت جیؔ اکدم مسکرا دئے۔دھوتی کا پلو سنبھالتے ہوئے انہوں نے میری طرف چمکدار آنکھوں سے دیکھا:''ارے ہُجور! گجب ہو گیا! ہم نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ ٹھاکر صاحب ایسا جواب دیں گے۔بالکل گجب ہو گیا صاحب!''

ابھی وہ شاید کچھ اور بھی کہتے مگر میں نے بے صبری سے ان کی بات کاٹ دی:''آپ یہ بتائیں کہ انہوں نے کیا کہا!''

''صاحب، آپ کی بات سن کر ٹھاکر صاحب کو ایسا اچنبھا ہوا کہ ہاتھ سے ٹھنڈائی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا! پھر بولے کہ ایسا کون مائی کا لال، جیالا جوان ادھر آ گیا ہے کہ ہم پر جرمانہ کرتا ہے اور پھر واپس نہیں لیتا ہے؟'' پنڈت جیؔ اپنی ترنگ میں بول رہے تھے اور ادھر اس مائی کے لال، جیالے جوان کی سٹّی گُم ہوئی جا رہی تھی!

میں نے بڑی گھبراہٹ سے پوچھا:''مگر پنڈت جیؔ! جرمانہ کا کیا ہوا؟ ٹھاکر صاحبؔ آخر کیا کہتے ہیں؟''

پنڈت بنی پرسادؔ کو شاید میری حالت پر ترس آ گیا اور وہ اصل بات کی طرف آ گئے:''ٹھاکر صاحبؔ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے جرمانہ رہنے دو۔پر ہماری بھی ایک سرط ہے۔انجینئر صاحبؔ سے کہو کہ وہ ہم سے ملنے آئیں۔چائے پانی پئیں گے اور کچھ بات چیت رہے گی۔''

اس عجیب شرط کو سن کر میرے تو چھکے چھوٹ گئے۔یوں سمجھئے کہ موت سامنے نظر آ رہی تھی اور بنی پرسادؔ جی تھے کہ میری حالت دیکھ کر ایسے مسکرائے جا رہے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں نے روہانسی آواز میں پوچھا:''پنڈت جیؔ آخر ٹھاکر صاحبؔ مجھ کو کیوں بلا رہے ہیں؟ کیا مارے پیٹیں گے مجھ کو؟''

''ارے رام رام! نہیں صاحب۔آپ پریسان نہ ہوں۔ٹھاکر جگراجؔ سنگھ ایسے آدمی نہیں ہیں۔پھر ہم بھی تو آپ کے ساتھ ہوں گے اور ساتھ ہی واپس لے آئیں

گے۔صاحب! آپ ہمارا کہنا مان لیجئے اور چلے چلئے۔ٹھاکر صاحبؔ کو ناراج کرنا اچھا نہیں ہے ہجور!'' پنڈت جیؔ اب بہت سنجیدہ ہو چکے تھے۔

پنڈت جیؔ کی آخری بات سے اب میں سو فیصد متفق رکھتا تھا۔مگر دل تھا کہ ڈر سے یوں دھڑک رہا تھا جیسے آج کے بعد پھر کبھی نہیں دھڑکے گا۔ٹھاکر صاحبؔ کے اڈّے پر جانے کا خیال ہی مجھ کو ادھ مرا کئے دے رہا تھا۔

میں نے جان بچانے کی آخری کوشش کی: ''پنڈت جیؔ! میں سرکاری ملازم ہوں۔میرا جانا مناسب نہیں ہے۔کیا پتہ کیا ہیر پھیر ہو جائے۔ٹھاکر صاحبؔ ہی ادھر ملنے کیوں نہیں آجاتے ہیں؟''

وہ میری بے چارگی اور معصومیت پر زیر لب مسکرائے اور پھر بولے: ''صاحب! آپ کسی ٹھیکہ دار سے ملنے کب جا رہے ہیں؟ پھر یہ بھی تو ہے کہ ٹھاکر صاحبؔ یہاں آئیں گے تو اکیلے تھوڑی آئیں گے۔ساتھ میں پانچ چھ لٹھیت ہوں گے۔اس میں تو بڑا اپھجیتہ ہوگا۔''

بات معقول تھی ایسے فضیحتہ کے امکانی نتیجوں کی جانب تو میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔ہتھیار ڈالتے ہوئے میں نے مری آواز میں پوچھا: ''اچھا پنڈت جیؔ! آپ کی ذمہ داری پر چلے چلتے ہیں۔کب جانا ہے؟''

''اگلی سنیوار کو ٹھاکر صاحبؔ کے یہاں پچھمی پوجا ہے۔اسی دن بلوایا ہے۔'' پنڈت جیؔ نے بتایا۔''اور ہاں صاحب! ٹھاکر صاحبؔ نے یہ بھی کہلایا ہے کہ پھکر نہ کریں۔وہ آپ کے لئے کھاس انتجام کروا رہے ہیں۔''

میرے پیروں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔''خاص انتظام؟ کیسا خاص انتظام؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''اب یہ تو ہم کو پتہ نہیں صاحب! ٹھاکر صاحبؔ ہم سے پوچھ کر کام تھوڑی کرتے ہیں!'' پھر تھوڑی دیر بعد پنڈت جیؔ اگلی سنیچر کی دوپہر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

-------(۳)-------

رکشہ پر میرے برابر بیٹھے ہوئے پنڈت بنی پرساؔد تھوڑی تھوڑی دیر بعد گلا صاف کرنے کو کھنکارتے اور رکشہ والے کو راستہ بتاتے جاتے تھے۔وہ آج کچھ گھبرائے گھبرائے سے نظر آرہے تھے۔بار بار کھنکارنا اور رکشہ والے سے خواہ مخواہ بات کرنا شاید اسی گھبراہٹ کی نشانیاں تھیں۔میری حالت تو یہ تھی کہ دل دھڑک رہا تھا، دماغ میں اول فول خیالات آرہے تھے اور بولتی بند تھی۔اِس حالت کو ابتر کرنے میں شاید اُن لٹھیت جوانوں کا ہاتھ بھی تھا جو سائیکلوں پر سوار، کاندھوں پر شام دار لاٹھیاں سجائے رکشہ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے اور بقول پنڈت جیؔ ہماری حفاظت کے ذمہ دار تھے۔پندرہ بیس منٹ کے بعد رکشہ ایک تنگ گلی میں ایک مکان کے سامنے رک گیا جس کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے لٹھیت کی ''رام، رام'' کا جواب پنڈت جیؔ نے اپنے مخصوص انداز میں دیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔

''رام رام ٹھاکر صاحب! یہ انجینئر صاحب آپ سے بھینٹ کرنے آگئے ہیں۔'' پنڈت جیؔ نے صحن میں مونڈھے پر بیٹھے ایک شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔

''رام رام پنڈت جیؔ! آیئے انجینئر صاحب ادھر آیئے!'' ٹھاکر صاحبؔ نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے برابر مونڈھے کی جانب اشارہ کیا۔میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ ملایا اور مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ٹھاکر صاحبؔ کے اردگرد مونڈھوں پر چار لوگ اور بیٹھے ہوئے تھے۔سب مجھ کو کچھ حیرت اور کچھ تمسخر کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔سوچتے ہوں گے کہ یہ کون بانگڑو ادھر آپھنسا! صحن میں نیم کے درخت کے پاس لگے نل کے قریب ایک شخص بڑی سرگرمی سے کچھ گھونٹ رہا تھا اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔میری نظریں ٹھاکر صاحبؔ سے ملیں تو ان کی مسکراتی ہوئی آنکھوں نے ایک لمحہ کہ وہ خوف میرے دل سے کم سا کر دیا جس سے وہ اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔

ٹھاکر جگراؔج سنگھ چالیس پینتالیس سال کے دراز قد، گٹھے بدن اور کُھلی رنگت کے وجیہہ شخص تھے۔چہرہ پر تاؤ دار گھنیری مونچھیں اور ہاتھ میں تین چار سونے کی انگوٹھیاں ان کی شخصیت کو رعب دار بنا رہی تھیں۔اِس رعب میں یقیناً'' اس دونالی بندوق کا بھی ہاتھ ہوگا جو اُن کے قریب دیوار کے سہارے کھڑی ہوئی تھی۔میں جب گھر میں داخل ہوا تھا تو ٹھاکر صاحبؔ کسی سے بات چیت کر رہے تھے۔چند لمحوں کے بعد وہ شخص پرنام کر کے چلا گیا تو ٹھاکر صاحبؔ میری جانب متوجہ ہوئے۔

''انجینئر صاحبؔ! آپ سے ملنے کا ہمارا بڑا دل کرتا تھا۔پنڈت جیؔ نے بتایا کہ جرمانہ واپس لینے پر آپ تیار نہیں ہیں۔ہم نے سوچا کہ ایسے جیالے سے ملنا جروری ہے جو ٹھاکر جگراؔج سنگھ پر جرمانہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے!'' ٹھاکر صاحبؔ بول رہے تھے اور میرے حواس ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔''بھلا آپ نے جرمانہ کیوں واپس نہیں لیا، صاحب!''

میں نے مرگھلّی آواز میں اپنے تئیں بہت اچھا جواب دیا: ''ٹھاکر صاحبؔ! جرمانہ واپس لینے میں میری بڑی بے عزتی ہوتی۔جیسے آپ کی عزت ہے ویسے ہی میری بھی ہے۔اور تو کوئی وجہ نہیں تھی۔''

''ہاں، اجّت کی بات تو ٹھیک ہے! ویسے بھی آپ نئے ہیں۔ اس بار تو کھیر کوئی بات نہیں ہے، مگر آگے جرا کھیال رکھئے گا۔'' انہوں نے کہا۔

میں نے تیزی سے سر ہلا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ آئندہ ایسے غلطی کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا! دراصل گردن یوں ہلانی پڑی کہ حلق نے خشک ہو کر ساتھ دینے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا! ٹھاکر صاحبؔ نے پاس بیٹھے ایک آدمی کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا اور وہ اُٹھ کر دوسری جانب کے برآمدہ سے ہو کر ایک دروازہ میں داخل ہو گیا جو شاید کسی کمرہ میں کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہاتھوں پر تھال لے کر واپس آیا اور قریب پڑی میز پر نمکین، چائے اور مٹھائی سجانے لگا۔ پنڈت جیؔ بھی اُٹھ کر اُس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

ٹھاکر صاحبؔ پھر میری جانب متوجہ ہوئے: ''تو صاحب! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ کچھ اپنا حال چال بتائیں۔ پنڈت جیؔ تو کہتے ہیں کہ آپ رشوت وشوت بھی نہیں لیتے ہیں! ایسا ہی سادھومُنی بننا تھا تو کاہے کو پی ڈبلو ڈیؔ میں نوکری کی؟ اب ہمارا آپ کا کام کیسے چلے گا؟'' ٹھاکر صاحبؔ مسکرا کر بولے۔

''جی ٹھاکر صاحبؔ! میں علی گڑھؔ کا ہوں۔ ابھی ابھی نوکری کی ہے۔ کہیں تو نوکری کرنی ہی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ پی ڈبلو ڈیؔ میں ایسا اندھیر ہے۔ مجھ سے یہ نوکری ہونی مشکل ہے۔ ڈھونڈ رہا ہوں۔ جیسے ہی کہیں اور نوکری مل جائے گی یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' ٹھاکر صاحبؔ کی مسکراہٹ اور لہجہ کی نرمی نے میری زبان ڈھیلی کر دی تھی!

ٹھاکر صاحبؔ حیرت سے بولے: ''ایں! پی ڈبلو ڈیؔ کی نوکری چھوڑ دیں گیا آپ؟ کیا گھاس کھا گئے ہیں صاحب؟ لوگ تو اس نوکری کے لئے مرے جاتے ہیں اور آپ چھوڑ رہے ہیں! ہے رام! سچ ہے کہ اب کَل یُگ آ گیا ہے! انجینئر لوگ بھی ایمانداری کی بات کرنے لگے ہیں!'' ان کی بات میں مذاق کا رنگ تھا۔ سب لوگ اس پر ہنس پڑے۔

چائے تیار تھی۔ ٹھاکر صاحب کے اشارہ پر سب لوگ نمکین، مٹھائی اور چائے سے شغل کر رہے تھے۔ میں نے چائے کا گھونٹ لے کے ٹھاکر صاحب کی طرف برفی کی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا: ''ٹھاکر صاحبؔ! کیا کروں، ماں باپ نے بچپن سے ایسا ہی سکھایا ہے۔ یہ دن رات کی دھاندلی مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔ میرے بعد جو انجینئر یہاں آئے گا اس سے شاید آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

ٹھاکر صاحبؔ میری بے تکی باتیں سن کر معلوم نہیں کس سوچ میں ڈوبے میری جانب غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے نیم کے پیڑ کے پاس بیٹھے شخص کی طرف دیکھ کر آواز لگائی: رام بھلاونؔ! جرا انجینئر صاحبؔ کے لئے ٹھنڈائی تو لا!''

رام بھلاونؔ چند لمحوں میں شیشہ کے گلاس میں ٹھنڈائی لے کر حاضر ہو گیا اور میرے سامنے گلاس رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا جیسے میرے ٹھنڈائی پینے کا تماشہ دیکھنے کا منتظر ہو۔ میں نے ٹھاکر صاحبؔ سے عرض کی: ''معاف کیجئے گا ٹھاکر صاحبؔ! میں بھانگ نہیں پیتا ہوں۔ مجھے یہ شوق نہیں ہے۔''

ٹھاکر صاحبؔ کے چہرہ سے حیرت کے ساتھ افسوس بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایسا بے فیض آدمی آج سے پہلے شاید کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''ٹھنڈائی نہیں پیتے صاحب؟ یہ تو عجیب سی بات ہوئی! اچھا ولایتی شراب منگا دیں، وہ تو پی لیں گے؟''

''ٹھاکر صاحبؔ! میں دیسی، ولایتی کسی قسم کی شراب نہیں پیتا ہوں۔ مجھے معاف کیجئے اور آپ پریشانی نہیں اُٹھائیے۔''

''ارے رام رام! انجینئر صاحبؔ! اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پر یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔ ٹھنڈائی آپ نہیں پیتے، رشوت بھی نہیں لیتے، شراب کا شوک بھی نہیں ہے۔ جرور جُوا بھی نہیں کھیلتے ہوں گے! صاحب پھر آپ جندگی میں مجے لئے کرتے کیا ہیں؟'' ٹھاکر صاحبؔ نے بڑی ہمدردی سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

ابھی میں اس بے ڈھب سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ پنڈت بنی پرساؔد بول اُٹھے: ''ٹھاکر صاحبؔ! لچھمی پوجا کا سمے کھتم ہو رہا ہے۔ اس کو پہلے کر لیں۔''

ہم لوگ ٹھاکر صاحبؔ کے پیچھے پیچھے برآمدہ کے دوسرے سِرے پر گئے جہاں صندل کی خوبصورت چَوکی پر سُرخ کارچوبی کپڑوں سے سجی ہوئی، سر پر سنہرا مکٹ لگائے اور ہاتھوں کو آشیرواد کے انداز میں اٹھائے لچھمی دیوی کی مسکراتی ہوئی مورتی براجمان تھی۔ چوکی پھولوں سے آراستہ تھی اور دیوی جیؔ کے چرنوں کے پاس ایک ناریل اور ایک پیتل کی خوبصورت سی گھنٹی رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف اگربتّی جل کر فضا کو معطر کر رہی تھی۔ سب لوگ مورتی کے سامنے بچھی دری پر ادب سے بیٹھ گئے۔

پنڈت جیؔ نے مورتی کے مقابل بیٹھ کر گھنٹی بجائی اور چند اشلوک پڑھ کر مورتی کے ماتھے پر تلک لگایا اور جھک کر اپنا ماتھا اس کے سامنے زمین پر ٹیک دیا۔ پھر گیندے کے ہاروں سے بھری ٹوکری سے ایک ہار نکال کر دیوی جیؔ کو پہنا دیا، جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے چرنوں کی بھینٹ چڑھایا اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر باری باری سب نے بڑھ کر دیوی جیؔ کو ہار پہنائے، بھینٹ دی اور پرنام کیا۔ دیکھتے دیکھتے دیوی جیؔ کی گردن ہاروں سے بھر گئی اور چرنوں میں روپوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پنڈت جیؔ نے تھالی میں ایک چاندی کا دیا رکھ کر مورتی کی آرتی اتاری اور سب پجاری آرتی اور پرساد سے فیض یاب ہو کر صحن میں واپس آ گئے۔ ایک میں ہی تھا جس نے اس پوجا میں کوئی حصہ نہیں لیا مگر پوجا کی سادگی اور پجاریوں کے خلوص اور عقیدت سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

-------(۴)-------

ٹھاکر صاحبؔ مونڈھے پر بیٹھے تو چہرہ سے پوجا کا سکون ظاہر تھا۔انہیں نے چند منٹ کے بعد رام بھلاونؔ سے کہا:

''رام بھلاونؔ،اب انجینئر صاحب کے لئے لچھمی دیوی کا کھاس آشیرواد لے آؤ۔دیر ہوئی جاتی ہے۔''

ان کے حکم کی تعمیل میں رام بھلاونؔ برآمدہ سے گذر کر کمرہ میں چلا گیا۔ٹھاکر صاحبؔ نے مٹھائی کی جانب اشارہ کیا:''لیجئے صاحب منھ تو میٹھا کر لیجئے۔آپ نے تو پرساد بھی نہیں چکھا۔''

میں برفی کا ٹکڑا ابھی منھ میں رکھ بھی نہیں پایا تھا کہ چوڑیوں کی کھنک نے چونکا دیا۔رام بھلاونؔ واپس آ چکا تھا۔اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دیوی جیؔ کے آشیرواد کو میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا!

تیکھا ناک نقشہ،چمپئی رنگ،ہلکی گلابی ساری میں ملبوس بھرا بھرا بدن،ہاتھ کہنیوں تک چوڑیوں سے بھرے ہوئے،سر جھکائے اور بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان لئے،وہ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی سارے بدن سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔چہرہ شرم،خوف اور پسینہ سے تمتما رہا تھا اور ہونٹ بری طرح لرز رہے تھے۔میں نے گھبرا کر ٹھاکر صاحبؔ کی طرف دیکھا جو مسکراتے ہوئے میری بدحواسی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

''انجینئر صاحبؔ! یہ آپ کے لئے کھاس انتجام کیا ہے ہم نے۔ہم کو جیالے لوگ بہت پسند ہیں۔آپ کو اور کوئی شوک نہیں ہے۔کیا لچھمی دیوی کے اس دان کو بھی ٹھکرا دیں گے؟''انہوں نے بڑے ہی گمبھیر لہجہ میں کہا۔

''جی ٹھاکر صاحبؔ کیا مطلب ہے آپ کا؟ یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟'' میں نے بڑی مشکل سے کانپتی آواز میں کہا۔

''یہ ہماری طرپھ سے آپ کو بھینٹ ہے۔جب تک چاہے رکھیں اور آپ کہیں تو یہیں کمرہ کا انتجام کر دیں ہم۔'' ٹھاکر صاحب نے مجھ سے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ ٹھاکر صاحب؟ مجھ سے یہ آپ کیا کرنے کو کہہ رہے ہیں؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کیا ہو گیا صاحب؟ کیا جندگی میں کوئی مجا لئے بِنا ہی مر جانے کا ارادہ ہے؟ ٹھاکر جگراؔج سنگھ ہر ایک کے ساتھ یہ بیوہار نہیں کرتے ہیں۔سوچ سمجھ کر اس بھینٹ کو ٹھکرانا صاحب!ہماری اِجّت کا سوال ہے!'' اب ان کے لہجہ کی سنجیدگی بڑی گہری اور خوفناک ہو گئی تھی۔

میں نے لچھمی دیوؔی کی بھیجی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا جس کے آنسو اس کے رخساروں سے پھسل کر اس کی ساری میں جذب ہونے پر آمادہ تھے۔مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو اور میرا دل اس لڑکی کے آنسوؤں میں گُھل کر مٹّی میں مل رہا ہو۔

''ٹھاکر صاحبؔ! آپ کو اپنی عزت کا خیال ہے مگر اس معصوم لڑکی کی عزت کا کون رکھوالا ہے؟'' میری آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔''اور میری عزت، میرے ماں باپ کی عزت کا کسے خیال ہے؟ آپ مجھ سے جو امید رکھتے ہیں،اس کو سوچ کر ہی مجھے شرم آتی ہے۔آپ بھی کسی ماں کے بیٹے ہیں۔شاید آپ کی بھی کوئی بیٹی اتنی ہی بڑی ہو گی جیسی یہ لڑکی ہے۔مجھ کو معلوم نہیں کہ اس کو آپ کہاں سے لائے ہیں،مگر لانے سے پہلے آپ نے اس کا دکھ اور درد نہیں دیکھا کیا؟ آپ اس علاقہ کے راجہ کہلاتے ہیں اور شاید مجھ کو جان سے مروا بھی سکتے ہیں۔مگر میں اپنے آپ کو اتنا نیچا گرانے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ پھر خود سے بھی کبھی آنکھ نہ ملا سکوں۔۔ٹھاکر جگراؔج سنگھ جی! آپ پر ایسی چھوٹی بات اچھی نہیں لگتی ہے۔''

ہی کہہ کر میں مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ٹھاکر صاحبؔ کا ایک آدمی میری طرف بڑھنے کے لئے مونڈھے سے اٹھا ہی تھا کہ اُن کے ہاتھ کے ایک اشارہ نے اسے مونڈھے پر واپس بٹھا دیا۔

''پنڈت جیؔ! میری واپسی کا انتظام کر دیجئے۔''میں نے پنڈت جیؔ سے کہا جن کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔''ٹھاکر صاحب!اب میں چلتا ہوں۔نمستے!''

پنڈت جیؔ نے ٹھاکر صاحبؔ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جن کے چہرہ کا رنگ کچھ کجلا سا گیا تھا اور جو خالی خالی نظروں سے مجھ کو دیکھے جا رہے تھے۔پھر ان کی آواز نے سب پر چھائی ہوئی بوجھل خاموشی کو توڑا۔یا تو میرے کان ہی بج رہے تھے یا پھر واقعی ان کی آواز کچھ بھرا سی رہی تھی۔

''پنڈت جیؔ!انجینئر صاحب کو ان کے گھر پہنچا دیجئے۔''پھر تھوڑا سا رک کر بولے:''رام بھلاون!کل صبح اس لڑکی کو اس کے گاؤں بھیج دینا۔اب اس کو اندر لے جاؤ۔''

رام بھلاونؔ کے پیچھے پیچھے وہ لڑکی کمرہ کے دروازہ کی جانب بڑھی۔اچانک وہ رک کر پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چل کر لچھمی دیوؔی کی مورتی تک گئی۔دیوی جیؔ کے گلے سے گیندے کا ایک ہار اُتارا اور میرے پاس آ کر اُسے میرے قدموں ڈال دیا۔پھر ہاتھ جوڑ کر مجھ کو روتی ہوئی آنکھوں سے پرنام کیا اور بھاگ کر سسکیاں لیتی ہوئی کمرہ کی تاریکیوں میں گُم ہو گئی!

گیندے کا ہار ہاتھ میں لئے مکان سے باہر نکلتے ہوئے پلٹ کر میں نے جب ٹھاکر جگراج سنگھ کو آخری مرتبہ دیکھا تو وہ سر اُٹھائے معلوم نہیں نیم کی شاخوں میں کیا دیکھ رہے تھے اور بار بار پلکیں جھپکا کر اپنی آنکھوں کی اس نمی کو پی جانے کی کوشش کر رہے تھے جو جانے کیوں اک دم اُمڈ آئی تھی!

پال جونز کا قرض

میں پال جونزؔ کا مسکراتا چہرہ دیوانوں کی طرح تک رہا تھا۔ میرے ماتھے کا پسینہ ٹپک کر آنکھوں میں آ گیا تھا۔ کچھ اُس کے نمک سے اور کچھ غم وغصہ سے میری آنکھیں نم ہو کر جھک سی گئی تھیں۔ بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور سانس کی دھونکنی زبانِ حال سے گویا کہہ رہی تھی کہ اب چل کر پھر کبھی نہیں چلوں گی۔ میرے ہاتھ پیر بے جان ہو کر رہ گئے تھے اور دماغ بالکل ماؤف۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پالؔ کا چہرہ صرف مجھ پر ہی نہیں ہنس رہا تھا بلکہ میری سات پشتوں کا مذاق اڑا رہا تھا، ان پشتوں کا جن سے میرا خمیر اٹھا تھا، جو اپنی شرافت اور نجابت پر ہمیشہ نازاں رہی تھیں۔ اس شرافت کا کچھ حصہ بہر حال میرے ورثہ میں بھی تو آیا تھا اور میں اس ورثہ پر فخر کرتا تھا، اور موقع بے موقع لوگوں پر اس کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ میں اپنی ذات سے بات اور وعدہ کا بڑا پابند تھا اور سچی، بے لاگ بات کہنے میں کم ہی چوکتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں کوئی متقی، پرہیزگار، پنج وقتہ نمازی قسم کا مسلمان تھا۔ مجھ میں بہت سے عیب تھے مگر لوگوں سے معاملات میں اپنے کھرے پن کے لئے بدنام بھی تھا۔ اور آج یہ دو کوڑی کا عیسائی کافر پالؔ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔

غم وغصہ کے ساتھ ایک اور احساس میرے ذہن و دماغ کو کچوکے لگا رہا تھا کہ پالؔ صرف مجھ پر نہیں ہنس رہا تھا بلکہ ایک پوری تہذیب، ایک روایت، ایک نظام اور ایک دین اس کے تمسخر کا نشانہ تھے۔ جس کردار کی بلندی، اخلاق کی پاکیزگی، تہذیب کی رواداری، معاملات کی صفائی اور حسنِ سلوک کا خوبصورت نقشہ میرے ماحول، میرے استادوں اور بزرگوں اور میری کتابوں نے بڑی کاوش سے ایک طویل مدت میں میرے ذہن میں بٹھایا تھا، وہ آج چیتھڑے چیتھڑے ہو کر فضا میں بکھر گیا تھا۔ وہ دینی وقار اور احساس برتری جنہوں نے ہمیشہ میری گردن اونچی رکھی تھی، آج پالؔ کی مسکراہٹ کے سامنے ریت کے قلعہ کی مانند اُڑا اُڑا دھم کر کے خاک نشیں ہو گئے تھے۔ میں بے کس و بے بس اُسے دیکھ رہا تھا اور پالؔ تھا کہ میرے سامنے کھڑا برابر مسکرائے جا رہا تھا۔

پال جونزؔ (Paul Jones) میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں کے والد جبل پورؔ کی گن کیرج فیکٹریؔ میں ملازم تھے اور فیکٹری کالونی کے سرکاری کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ وہ عیسائی تھا اور میں مسلمان، مگر بچپن ایسے اختلافات اور تعصّبات سے آزاد ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ محلّہ کے دوسرے ہندو، مسلمان، سِکھ اور عیسائی بچوں کے ہمراہ کھیلتے، کودتے، لڑتے، جھگڑتے بڑے ہوتے رہے۔ ہر اتوار کو پالؔ اپنے ماں باپ کے ساتھ چرچ جایا کرتا تھا اور واپس آ کر اپنے پادری فادر جانؔ کہ برا بھلا کہتا کہ: ''یار! بڑا بور کرتا ہے۔ اتنی دیر بولتا ہے کہ نیند آنے لگتی ہے۔ پھر سالے کی بات بھی اپنے پلے نہیں پڑتی ہے۔'' اُدھر میں جمعہ کو مسجد نماز پڑھنے چلا جاتا تھا۔ ہر اتوار کی صبح جب مولوی سمیع اللہؔ قرآن پڑھانے آتے تو مارے باندھے بیٹھ تو جاتا مگر سارے وقت دل کھیل میں پڑا رہتا تھا۔

کچھ دنوں میں ہم دونوں نے ہائی اسکول پاس کر لیا تھا اور رابرٹسن کالجؔ میں داخلہ لے لیا تھا۔ جیسے تیسے پالؔ تھرڈ ڈویژن میں بی اے کر کے فیکٹری میں ملازم ہو گیا تھا اور میں ایم اے کی تعلیم میں مشغول ہو گیا تھا۔ مگر ہمارا یارانہ ہر حال میں قائم رہا۔ ہر دوسری تیسری شام وہ میرے گھر آ جاتا یا میں اس کے گھر چلا جاتا۔ سامنے کے ہوٹل میں دوسرے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے اور برفی کا دور چلتا، تاش اور شطرنج کی بازیاں جمتیں یا پھر دونوں سائیکل داب کر سنیما دیکھنے شہر چل دیتے جو ہماری کالونی سے تین چار میل کے فاصلہ پر تھا۔ تقریباً'' ہر اتوار دونوں ساتھ گذارتے، دن میں تفریح اور شام والی بالؔ! کیا مزے کی زندگی تھی!

ایک شام پالؔ نے میرے گھر کی کنڈی کھٹکھٹا کر آواز دی۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ خلاف معمول وہ اداس صورت لئے سر جھکائے کھڑا تھا۔ علیک سلیک بھی مرے مرے انداز سے کی۔ میں نے ہاتھ ملا کر اس سے پوچھا: ''کیوں یار! کیا بات ہے؟ یہ رونی صورت کیوں بنا رکھی ہے؟''

''کیا کہوں، عجیب مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ کسی اور سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تمہارے پاس آ گیا کہ شاید کام بن جائے۔''

میں نے پوچھا: ''ایسی کون سی مشکل آ پڑی ہے؟ کچھ معلوم تو ہو۔ اگر کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔''

اس نے کہا: ''یار کیا بتاؤں۔ پرسوں تک مجھ کو دو ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ معاملہ ٹیڑھا ہے اور ٹلنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔ اپنی قسم، بس

دو ماہ میں واپس کر دوں گا۔''

''دو ہزار روپے؟ کچھ سنک گئے ہو کیا؟ بھلا دو ہزار روپے میرے پاس کہاں ہیں؟ ابّا فیکٹری میں ملازم ہیں۔ تمہیں سب خبر ہے۔ بھلا یہ رقم کہاں سے ملے گی؟''

بات سچ تھی۔ پالؔ چند لمحہ خاموش رہا۔ پھر وہ دیر تک اپنی شدید ضرورت کا ذکر کرتا رہا۔ میں بھی اپنے جگری دوست کی مدد کرنی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس وعدہ پر رخصت لی کہ دوسرے دن انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔

دوسرے دن بھی انتظام تو کیا کرتا، چند دوستوں سے اپنی فرضی ضروریات کا ذکر کر کے سو سو، دو دو سو روپے لئے۔ کچھ اپنی ماںؔ سے لئے اور کچھ اپنی جیب سے نکالے۔ غرض کہ شام تک روپوں کا انتظام کر کے پالؔ کے گھر گیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بار بار آنسو بھری آنکھوں سے روپے دیکھتا اور کہتا:

''یار تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ بہت بڑا کام ہو گیا آج۔ اپنی قسم! بس دو ماہ میں پیسے واپس کر دوں گا۔''

اور اُدھر میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ چلو آج دوست کے کسی کام تو آیا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ دو ماہ پھیل کر چار اور چھ ہو گئے، یہاں تک کہ سارا سال گذر گیا مگر پالؔ کی قسم پوری نہیں ہوئی۔ اس مدت میں دوستوں کو کسی طرح بھرا اور ان کا قرض مختلف حیلوں سے ادا کیا۔ ماں سے تو کیا لینا دینا تھا۔ اس غریب نے تو بھول کر بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔ البتہ پالؔ سے کتنی ہی مرتبہ دبے الفاظ میں قرض کی ادائیگی کا ذکر کیا، اپنی ضرورت بھی ظاہر کی اور بعض مرتبہ جھلاّ کر صاف صاف الفاظ میں روپے مانگے۔ لیکن وہ ظالم ہمیشہ کنّی کاٹ گیا۔ کبھی مسکرا کر سُنی اَن سُنی کر دیتا، کبھی اپنی مجبوری کا رونا رو کر مزید مہلت مانگ لیتا اور کبھی ہنس کر مذاق میں بات ٹال دیتا: ''یار تم نے تو حد کر دی! ارے میں روپے لے کر کہیں بھاگ جاؤں گا کیا؟ ذرا سا اور صبر کرو۔ آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔''

وقت کے ساتھ میرا یہ احساس بڑھتا گیا کہ پالؔ ہماری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا اور اس کے جھوٹے وعدے ہر لمحہ ہمارے تعلقات کے شیشہ میں نہ جانے کتنے بال ڈالتے جا رہے تھے۔ مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ جوں جوں وقت گذر رہا تھا پالؔ کا رویہ بھی بدل رہا تھا۔ اب وہ بعض اوقات مجھے آتا دیکھتا تو دور سے ہی کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ شطرنج اور تاش کی بازیوں میں پہلی سی گرم جوشی نہیں رہ گئی تھی اور ہر وقت کی بیٹھک اب گنڈہ دار ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک دن یوں ہی خیال آیا کہ کیوں نہ فادر جانؔ سے ذکر کروں۔ آخر پالؔ ان کے چرچ کا ممبر تھا۔ ممکن تھا کہ ان کے بیچ میں پڑ کر سفارش کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے۔ یوں بھی فادر جانؔ اپنی خوش خلقی اور انسان دوستی کے لئے مشہور تھے۔ میں دوسرے دن ہی فادر جانؔ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ چرچ میں اپنے دفتر کے باہر لان میں ٹہل رہے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ پالؔ کی وعدہ خلافی کا رونا رویا اور اور ان سے سفارش کی درخواست کی۔ وہ میری رام کہانی غور سے سنتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں نہ معلوم کیوں مجھے ہمدردی کی روشنی کے ساتھ غم و غصہ کی کجلاہٹ اور چہرہ پر دل برداشتگی کی جھلک نظر آئی جیسے پالؔ کا رویہ انہیں بہت ناگوار گذرا ہو۔

وہ چند لمحہ سوچتے رہے اور پھر بولے: ''اچھا! آپ ایک منٹ ٹھیرئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرہ میں چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ایک لفافہ تھامے برآمد ہوئے۔ انہوں نے لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا:

''یہ لفافہ آپ پالؔ کو دے دیجئے گا۔ مجھ کو یقین ہے کہ وہ آپ کا قرض جلد ہی ادا کر دے گا۔''

میں نے لفافہ لے کر فادر جانؔ کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ وقت ضائع کرنے کا بھلا کیا سوال تھا۔ سیدھا پالؔ کے گھر پہنچا۔ میری آواز پر وہ باہر نکل کر آیا اور یوں ہی سی علیک سلیک کے بعد میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے لفافہ اس کو دیتے ہوئے کہا: ''یہ لفافہ فادر جانؔ نے تمہیں بھیجا ہے۔''

پالؔ نے لفافہ پھاڑ کر رقعہ نکالا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پرچہ پڑھ کر اس کے چہرہ پر ایک غبار سا گذر گیا۔ اس نے اشارہ سے مجھ کو رکنے کو کہا اور خود پلٹ کر گھر میں داخل ہو گیا۔ چند منٹ میں وہ واپس آیا تو ہاتھ میں ستلی سے بندھا ہوا نوٹوں کا ایک بنڈل تھا۔ اس نے روپے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ''یار! مجھے معاف کرنا۔ تمہارے روپے واپس کرنے میں بڑی دیر ہو گئی۔ میں بڑا شرمندہ ہوں۔ لو یہ رہے تمہارے دو ہزار!''

میں اس کایا پلٹ سے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ کبھی اُسے دیکھتا اور کبھی روپوں کو۔ جو کام ہماری عمر بھر کی دوستی اور بعد کی دل برائی نہیں کر سکی تھی وہ فادر جانؔ کے ایک رقعہ نے کر دیا تھا۔ میں نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں پالؔ سے پوچھا: ''پالؔ! یہ کیا بات ہوئی؟ آخر فادر جانؔ نے تمہیں ایسی کیا بات لکھی کہ تم نے اسے دیکھتے ہی قرض اتار دیا؟''

پالؔ نے میری جانب عجیب گمبھیر نگاہوں سے دیکھا اور رقعہ میری جانب بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولا: ''میں کیا بتاؤں۔ تم خود ہی پرچہ پڑھ لو۔''

میں نے پرچہ اس کے ہاتھ سے لیا۔ چھوٹے سے سفید کاغذ پر فادر جانؔ کے ہاتھ کی ایک سطر لکھی ہوئی تھی:

''بھائی پال! تم مسلمان کب سے ہو گئے ہو؟''

ننانوے سال کا پھیر

حافظ حاجی مفتی صدرؔالدین صاحب کا چہرہ اس وقت غیظ وغضب سے تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور پیشانی پسینہ کے نور سے چمک رہی تھی۔ فتاوی ہندیہؔ کی موٹی جلد ان کے ہاتھ میں جکڑ کر رہ گئی تھی اور ان کے بدن کی کپکپاہٹ کے ساتھ ان کی سفید نورانی داڑھی بھی ہلکوریاں کھا رہی تھی۔ اگر رمضان کا مبارک مہینہ نہ ہوتا اور مفتی صاحبؔ کو اپنے روزے کا پاس نہ ہوتا تو معلوم نہیں ثناءاللہؔ پر اس غصہ کی بجلی کس طرح گرتی اور ان کا کیا حشر بناتی۔

تخت کے کونے پر شیخ قدرت اللہؔ سر جھکائے ہراساں بیٹھے تھے اور اس غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لئے ان کا کاروباری دماغ تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ ادھے ان کی بہن دلشاد بیگم شیخ صاحب کی اوٹ میں سر نیوڑھائے، کالے برقعہ کے کانے گھونگھٹ سے گھبرا گھبرا کر سب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے رہ رہ کر ان مردوں پر غصہ آ رہا تھا جو ہر بات میں جھگڑے کا پہلو نکال لیتے تھے اور خواہ مخواہ بحث میں الجھنا ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ایسی دنیا سے بیزار تھی جس کا ہر قانون مردوں نے اپنی طاقت کے زعم میں خود اپنے حق میں ڈھال لیا تھا اور اپنی خود ساختہ برتری پر نازاں بھی تھے۔

دوسری جانب چودھری کریم احمدؔ سٹپٹائے سے نظر آ رہے تھے۔ چوھری صاحب کچھ اپنی چودھراہٹ کے زعم میں اور کچھ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی اپنی پرانی عادت سے مجبور ہو کر شیخ صاحبؔ کے ساتھ چلے آئے تھے اور اب پریشان نظروں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی مفتی صاحبؔ کو اور کبھی ثناءاللہؔ کو دیکھ رہے تھے جو اس ہنگامہ کا باعث تھے۔ ایک طرف منشی کفیل احمدؔ بھونچکا سے بیٹھے شاید دل ہی دل میں ''جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو'' کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک ثناءاللہؔ ہی تھے جو ایسے اطمینان سے مفتی صاحبؔ کی سرخ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے تھے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔

معلوم نہیں شیخ قدرت اللہؔ کس جھونک میں ثناءاللہؔ کو اس مہم میں بطور کمک لیتے آئے تھے۔ سب لوگ ثناءاللہؔ کی کھردری طبیعت سے واقف تھے۔ وہ سارے زمانے میں منہ پھٹ مشہور تھے۔ کچھ کہنے پر آتے تو بے جھجک اور بلا لحاظ بولتے تھے۔ بات بولنے سے پہلے تولنے کے تصور سے ثناءاللہؔ مطلق نا آشنا تھے اور لوگ ان سے مشورہ کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ شاید آج شیخ صاحبؔ کی مت ماری گئی تھی جو انہیں ساتھ لے آئے تھے، اور اپنی اس حماقت کا خمیازہ بقول ثناءاللہؔ ''تھوک کے حساب سے'' بھگتتے نظر آتے تھے۔

مفتی صاحبؔ اگر غصہ میں تھے تو کوئی حیرت کی بات نہیں تھی بلکہ اگر غصہ نہ کرتے تو حیرت کا مقام ہوتا۔ ثناءاللہؔ نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ منشی جیؔ بھی ایک لمحہ کو چونک گئے تھے جب کہ مدت سے افیم کا مستقل ہلکا نشہ ان کے اس طرح چونک جانے میں مانع تھا۔ بڑی مشکل سے مفتی صدرالدینؔ صاحب نے اپنے ہونٹوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے، غصہ سے پھٹی پھٹی آواز میں ثناءاللہؔ کی مزاج پرسی کی:

''یہ آپ نے کیا نامعقول بات کہی؟ میں گھاس کھا گیا ہوں؟ آخر بات کرنے کا کوئی طریقہ ہوا کرتا ہے۔ کیا آپ نے تمیز سے بات کرنے کا سلیقہ کبھی نہیں سیکھا کہ جو منہ میں آتا ہے بے دھڑک کہہ دیتے ہیں؟ آدمی کو کچھ تو اللہ کا خوف اور دوسروں کی عزت کا خیال ہونا چاہئے کہ ایسی باتوں سے پرہیز کرے۔ میں گھاس کھایا ہوا نظر آتا ہوں آپ کو؟ لاحول ولاقوۃ۔''

ساری محفل اس تقریر کو سن کر گم سم تھی اور شیخ قدرت اللہؔ خواہ مخواہ شرمندہ ہو کر دری کو انگلی سے کریدے چلے جا رہے تھے۔ مگر کیا مجال جو ثناءاللہؔ پر کوئی اثر ہوا ہو! وہ ایسی آسامی نہیں تھے جو کسی کی بزرگی یا علمیت سے مرعوب ہو جاتے۔ پھر ''مُلّا ٹوں'' سے تو وہ اور بھی بدظن رہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ: ''سب مُلّا ٹے فراڈ ہیں اور جاہل لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنے پیسے سیدھے کرتے ہیں!'' وہ یوں تو شاید مفتی صاحبؔ کی بات سنی ان سنی کر دیتے لیکن اپنی معقولیت پر حملہ کا جواب انہیں ضروری معلوم ہوا۔

ثناءاللہؔ نے قصداً ''چبا چبا کر عرض کی: ''مولی ساب! اگر بات معقول ہو تو جواب بھی اس کا سیدھا اور معقول ہو۔ جب آپ باتیں ایسی کریں گے تو پھر جواب بھی ویسا ہی ملے گا! آپ خود ہی سوچئے کہ بھلا یہ ننانوے سال والی بات عقل میں آتی ہے؟ کوئی تُک ہے اس کی؟''

مفتی صاحبؔ نے اپنی جلالی آواز میں جواب دیا: ''اگر آپ کی عقل میں نہیں آتی ہی تو پھر آپ کی عقل ہی ناقص ہے۔ یہ شریعت کا معاملہ ہے اور اس میں چون و چرا کی نہ اجازت ہے اور نہ کوئی گنجائش۔ بھلا انسان کا اللہ کے قانون میں کیا دخل؟ بہر حال حنفی فقہ کا یہی فیصلہ ہے۔ آپ کون سے جید عالم ہیں جو کسی معاملہ میں اپنی رائے رکھیں گے!''

ثناءاللہؔ نے جواب دیا: ''مولی ساب! میں عالمِ دین تو نہیں ہوں مگر عقل تو رکھتا ہوں! پھر آپ جو فتویٰ وہ کسی شخص کی رائے ہی تو ہے، قرآن یا حدیث تو نہیں ہے کہ اس پر کچھ کہنے کی گنجائش نہ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسی واہیات بات قبول کیسے کر سکتے ہیں!''

مفتی صدرالدینؔ صاحب ابھی اس بے ڈھب حملہ کا جواب دینے ہی والے تھے کہ شیخ قدرت اللہؔ نے جھٹ جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دونوں ہاتھوں کی طشتری میں ان کی جانب بڑھا دیا:

''حافظ صاحبؔ! ہماری جانب سے یہ نذرانہ قبول کیجیے۔ بڑا وقت لیا آپ کا ہم نے۔''

چودھری صاحبؔ تو پر تول ہی رہے تھے۔ کھٹ سے تخت سے اتر کر جوتیاں پیروں میں ڈالنے لگے۔ دلشاد بیگمؔ بھی مسافر کی گٹھری کی طرح اٹھ بیٹھی۔ منشی جیؔ اور ثناءاللہؔ بھی محفل کا یہ رنگ دیکھ کر تخت سے اتر آئے اور سب لوگ مفتی صاحبؔ کی بیٹھک سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئے۔ شیخ قدرت اللہؔ کے چہرہ سے کبیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ ثناءاللہؔ کی طرف برابر کڑوی نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ آخر نہ رہا گیا اور بول ہی تو پڑے:

''بھائی ثناءاللہؔ! کسی وقت تو اپنی حرکت سے باز آ جایا کرو۔ نہ وقت دیکھتے ہو اور نہ آدمی پہچانتے ہو، پھٹ سے اوٹ پٹانگ کہہ جاتے ہو۔ بھلا حافظ صاحبؔ سے بحث کا یہ کون سا موقع تھا؟''

ثناءاللہؔ نے اپنی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ کی اوٹ سے جواب دیا: ''یار! تم نے مولی ساب کی بات سنی کہ نہیں؟ کون اُلّو کا پٹھا نا وے سال بات مانے گا؟ تم ہی کہو اس سے زیادہ واہیات بات کوئی کہہ سکتا ہے؟''

چودھری صاحبؔ نے مناسب جانا کہ اس نئی آگ پر ٹھنڈا پانی ڈالا جائے: ''چھوڑیں بھائی، چھوڑیں! یہ کہئے کہ اب کیا ہو؟ مفتی صاحبؔ نے تو حتمی فیصلہ سنا کر سب دروازے بند کر دئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اب سوائے صبر اور کوئی چارہ نہیں ہے!''

شیخ صاحبؔ نے دلشادؔ کی جانب دیکھ کر بڑی درد بھری آواز میں کہا: ''چودھری صاحبؔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اللہ کی مرضی میں انسان کا کیا دخل؟ بھلا اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟''

ثناءاللہؔ بھنّا ہی تو گیا: ''لاحول ولا قوۃ! عجیب ہیں آپ لوگ بھی! ایک کٹھ مُلا نے الٹی سیدھی بات کہہ دی اور آپ لوگوں نے ہاتھ پیر ڈال دئے! شیخ صاحبؔ! آپ کیسے بھائی ہیں کہ بہن کا درد دل میں نہیں ہے؟ چلئے، چل کر سرائے رحمٰن کی مسجد کے امام صاحب سے بات کرتے ہیں۔ دیکھیں تو وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ شافعی ہیں۔ ممکن ہے کہ مسئلہ کا کوئی حل سجھا دیں!''

شیخ صاحبؔ کچھ ان کے غصہ سے گھبرا کر اور کچھ اپنی کاروباری ذہنیت سے مجبور ہو کر راضی ہو گئے اور یہ قافلہ بقول ثناءاللہؔ ''باجماعت'' سرائے رحمٰن کی جانب چل دیا۔

میں شام دفتر سے گھر پہنچا تو بیگم ڈرائنگ روم میں کسی صاحبہ سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ مجھ کو دیکھ کر دونوں خاموش ہو گئیں اور جب میں کپڑے بدل کر اور منھ ہاتھ دھو کر چائے کی میز پر آیا تو وہ صاحبہ رخصت ہو چکی تھیں مگر بیگم کچھ سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ چائے کی میز پر بیٹھا تو میں نے موقع غنیمت جان کر پوچھا:

''کیا بات ہے بھئی؟ آج بڑی کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی ہو۔

بیگم نے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا: ''اے کھوئی ووئی تو خاک نہیں ہوں۔ کم بخت بات ہی ایسی ہے۔ ابھی منشی جیؔ کی بیوی جو آئی تھیں نا تو وہ عجیب خبر لائی ہیں۔''

میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے رسماً پوچھا: ''کیوں کیا عجیب خبر ہے؟''

''ارے! بات کیا ہوتی۔ وہی دلشادؔ کا قصہ ہے۔'' پھر میری سوالیہ نگاہوں کے جواب میں ذرا تفصیل سے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: ''ارے وہی شیخ قدرت اللہ کی بہن دلشادؔ! نیک بخت کی اچھی خاصی شادی ہو گئی تھی۔ اللہ نے ایک بیٹی بھی دی۔ نہ معلوم اس نامراد جمیلؔ کو کیا سوجھی کہ کاٹن مل کی لگی لگائی نوکری چھوڑ کر بمبئی کا شوق چرّایا۔ اور گیا تو پھر معلوم نہیں کہ زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ دس سال ہو گئے مُوا لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ جب سے دکھیا بیٹی کو سینہ سے لگائے بیٹھی ہوئی ہے۔''

میں نے ضروری سمجھا کہ بیگم کے جذبۂ ہمدردی میں شامل ہو جاؤں۔ عدم شرکت سے چائے کا مزا کرکرا ہو جانے کا امکان تھا: ''ہاں! یہ تو سب کو معلوم ہے۔ افسوس

اس بات کا ہے کہ بیچاری کے ماں باپ کے مرجانے کے بعد بھابھی نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ شیخ صاحبؔ خاموش رہ کر اس ظلم میں برابر کے شریک ہیں۔''

بیگم اب بھڑک سی گئی تھیں: ''ظلم تو ہے ہی! ارے شیخ صاحبؔ کی بیوی نے اس غریب کو ماما سے بدتر بنا رکھا ہے۔ دن بھر خدمت لیتی ہے۔ روکھا سوکھا کھانے کو دیتی ہے۔ اوپر سے باتیں الگ سے سناتی ہے کہ کب تک مفت کے ٹکڑے توڑتی رہے گی؟ اب وہ نیک بخت جائے بھی تو کہاں جائے؟ شیخ صاحبؔ ایسے زن مرید ہیں کہ سب دیکھتے ہیں اور دُم دبائے خاموش رہتے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں ہیں؟''

''ارے بھئی! میرے سمجھانے سے بھلا وہ مانیں گے؟ پھر کسی کے گھریلو معاملہ میں دخل دینے کا میں قائل نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ دِل بُرائی ہو جائے گی۔ مگر یہ قصہ تو پُرانا ہے۔ منشی جی کی بیوی گڑے مُردے کیوں اُکھاڑ رہی ہیں؟''

''اجی قصہ یہ ہے کہ منشی جی کے دوست عبدالقدیرؔ، وہی جن کی بیوی پچھلے سال فالج سے مر گئیں تھیں، اللہ اسے جنت نصیب کرے، وہ دلشادؔ سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے منشی جی سے کہا ہے کہ شیخ صاحبؔ تک پیام پہنچا دیں۔ اب مشکل ہی ہے کہ اس کا تو شوہر دس سال سے لاپتہ ہے۔ دوسری شادی وہ کر بھی سکتی ہے کہ نہیں؟ منشی جی اور شیخ صاحبؔ کل مفتی صدرالدینؔ صاحب سے ملنے جائیں گے۔ اللہ کرے کہ کوئی بات بن جائے اور غریب دلشادؔ کا کوئی سہارا ہو جائے۔

معاملہ تو یقیناً'' نازک اور پیچیدہ تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ چائے اور نمک پاروں کے گمبھیر مسئلہ پر بھی تھوڑی سی توجہ اور دوں۔ بیگم بھی شاید دل کی بھڑاس نکال چکی تھیں۔ کچھ دیر میں وہ بھی باورچی خانہ کی طرف چلی گئیں اور میں نے اخبار اٹھا کر ''حالاتِ حاضرہ'' کے مطالعہ میں اس قضیہ کو غرق کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

مسجد سرائے رحمٰن کے امام صاحب مولانا محمد حسینؔ صاحب عصر کی نماز پڑھا کر مسجد سے نکل ہی رہے تھے کہ شیخ صاحبؔ کا قافلہ وہاں پہنچ گیا۔ مولانا دھیمے دھیمے قدموں سے اپنے مکان کی طرف جا رہے تھے کہ شیخ قدرت اللہؔ نے بڑھ کر سلام کیا اور اپنا تعارف کرا کے ان سے چند منٹ کا وقت مانگا۔ مولانا نے سر کے اشارہ سے آگے چلنے کو کہا اور چند منٹ میں یہ لوگ اُن کی بیٹھک میں پہنچ گئے۔ دلشادؔ کو دیکھ کر مولانا پہلے چونکے تھے لیکن جب شیخ صاحبؔ نے اس سے اپنے رشتہ اور معاملہ کی اہمیت کی جانب اشارہ کیا تو وہ خاموش ہو گئے تھے۔

''ہاں بھئی شیخ صاحبؔ! کیا بات ہے؟'' مولانا محمد حسینؔ صاحب نے کمالِ لطف سے فرمایا۔

''جی مولانا! قصہ یہ ہے کہ میری بہن کا شوہر دس سال سے لاپتہ ہے۔ بمبئی ملازمت کی تلاش میں گیا تھا۔ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ ہزار کوشش کی لیکن کوئی پتہ نہیں چلا۔ اس کے ای گیارہ سال کی بچی بھی ہے۔ ماشاءاللہ سیانی ہو رہی ہے۔ مجھ سے جو ہو سکتا ہے بہن کے لئے کرتا ہوں۔''

دلشادؔ نے سر جھکا کر چہرہ بُرقعہ کی آڑ میں ذرا سا اور چھپا لیا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے ہونٹوں کی وہ زہریلی مسکراہٹ دیکھ لے جو شیخ صاحبؔ کی باتیں سن کر آ گئی تھی۔ مولانا بدستور شیخ صاحبؔ کی جانب ہمہ تن متوجہ تھے۔

شیخ صاحبؔ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: '' تو مولانا! حال ہی میں منشی جی کے دوست عبدالقدیرؔ نے میری بہن سے نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ اس کا شوہر تو دس سال سے لاپتہ ہے، شریعت اجازت دیتی ہے کہ نہیں؟ ہم لوگ سُنّی حنفی ہیں۔ مفتی صدرالدینؔ صاحب کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ حنفی فقہ کی رو سے شوہر کے لاپتہ ہو جانے پر بیوی کو ناوے سال تک انتظار کرنا ہوگا۔ پھر وہ دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ اب مولانا! آپ غور فرمائیں۔۔۔'' ابھی شیخ صاحبؔ کا بیان ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ثناءاللہؔ کی ہنسی کھی کھی نکل گئی۔ مولانا نے انہیں گھور کر دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر اُٹھے اور الماری سے ایک بوسیدہ سی کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

بیٹھک میں ہر شخص ہوں خاموش بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ فضا بوجھل تھی اور اس خاموشی کا سینہ مولانا کے صفحات پلٹنے کی سرسراہٹ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کاٹ دیتی تھی۔ چند منٹ بعد مولانا محمد حسینؔ صاحب نے کتاب اپنے زانو کے پاس رکھ لی اور ایک گہری سانس لے کر شیخ صاحبؔ کی جانب متوجہ ہوئے:

''شیخ صاحبؔ! حنفی فقہ سے تو میں واقف نہیں ہوں۔ مفتی صدرالدینؔ صاحب نے جو کہا ہوگا ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ ہم شافعی مسلک کے ہیں اور ہمارے فقہ میں یہ ہے کہ شوہر اگر لاپتہ ہو جائے تو بیوی سات سال اس کا انتظار کرنے کے بعد دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ آپ کے بہنوئی تو دس سال سے لاپتہ ہیں۔ چنانچہ شافعی مذہب کے مطابق اس دوسرے نکاح میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''

شیخ صاحبؔ نے بڑی پریشانی کے لہجہ میں عرض کیا: ''مگر مولانا! ہم لوگ تو حنفی ہیں۔ باپ دادا سُنّی حنفی رہے ہیں۔۔۔۔''

شیخ صاحبؔ ابی اپنی دینی مجبوری پر نہ جانے اور کیا کہتے کہ اچانک چوڑیوں کی کھنک سُن کر چپ ہو گئے اور مُڑ کر دلشادؔ کی جانب دیکھا جو ایک ہاتھ سے دوپٹہ ٹھیک کر رہی

تھی۔اس نے مولانا محمد حسینؔ صاحب کی طرف اشک آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نرم مگر صاف لہجہ میں کہا:''مولوی صاحب! میرے بھائی اور باپ دادا سُنی حنفی ہوں گے ۔میں خود آج سے شافعی ہوں۔کیا آپ میرا نکاح پڑھا دیں گے؟''

راوی کہتا ہے کے شیخ قدرت اللہؔ نے اس دیدہ دلیری پر اپنی خاندانی ناک کے کٹ جانے کا بہت درد سے اعلان کیا لیکن ثناء اللہؔ نے دلشادؔ کو اپنی منھ بولی بہن بنا کر اس کا نکاح عبدالقدیرؔ سے شافعی مسلک میں کروا دیا۔یہ بھی سنا ہے کہ ثناء اللہؔ اب شافعی ''مُلّا ٹوں'' کو برا بھلا کہنے سے پرہیز کرتے ہیں!

ہوٹیل، موٹیل اور پٹیل

(امریکہ میں Hotel کا تلفظ ہوٹیل کیا جاتا ہے۔ موٹیل دراصل Motor-Hotel کا مخفف ہے اور سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ایسے ہوٹلوں کو کہتے ہیں جن کو دن بھر کے تھکے ہارے مسافر رات بسر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اپنی موٹر کاریں عموماً ''اپنے کمروں کے سامنے ہی کھڑی کرتے ہیں۔ پٹیلؔ ہندوستان کی ریاست گجراتؔ کی وہ تجارت پیشہ قوم ہے امریکہ میں بے شمار چھوٹے اور سستے موٹیل خرید رکھے ہیں۔ یہ موٹیل اب اس قوم کی شناخت بن چکے ہیں۔)

میں اس سنیچر کی صبح سامنے میز پر بکھری کتابوں سے سر کھپاتے کھپاتے تھک گیا تھا اور جھنجھلاہٹ میں اس وقت کو برا بھلا کہہ رہا تھا جب میں علیگڑھ کی بے فکر اور کھلی فضا چھوڑ کر امریکہ مزید تعلیم حاصل کرنے یا بقول جاگیر سنگھؔ ''جھک مارنے'' آیا تھا۔ اچانک کنارے رکھے ٹیل فون کی ''ٹرن، ٹرن'' بجتی گھنٹی نے میرے ذہن کی چلتی گاڑی میں اڑنگا لگا دیا۔ دھت تری کی! یہ صبح صبح کس نے فون کر مارا؟ کتابیں دیکھ دیکھ کر یہاں حواس باختہ ہو رہے ہیں، امتحان کی فکر کھائے جا رہی ہے، پروفیسر صاحب کا ''کھی کھی'' کرتا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آ کر ڈرا رہا ہے اور لوگ ہیں کہ نہ وقت دیکھتے ہیں اور نہ ہی آدمی پہچانتے ہیں۔ جب جی چاہا فون اٹھایا اور نمبر ڈائل کر دیا، جیسے ہمیں زندگی میں صبح شام فضول فون کے جواب دینے کے علاوہ کوئی اور کام تھوڑی رہ گیا ہے۔ لاحول ولاقوۃ!

میں نے دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے بیزاری سے فون اٹھایا: ''ہیلو! میں رازؔ بول رہا ہوں۔''

شاید میری دلی جھنجھلاہٹ اور ذہنی کیفیت میری آواز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ دوسری طرف سے جاگیر سنگھؔ کی گونجتی ہوئی آواز نے جواب دیا: ''اوئے پُتّر! کی گل اے؟ تَین ایسا گُسہ کیوں چڑیائے؟ کی رات نوں نیند نئیں آئی؟''

جاگیر سنگھؔ کا مجھ ایسے غیر پنجابی سے ایسی بے دھڑک پنجابی بولنا صاف بتا رہا تھا کہ وہ تھوڑی بہت چڑھائے ہوئے ہے۔ ویسے عام طور پر وہ ہم دوستوں سے بازاری اُردو، ہندی میں ہی بولتا تھا۔ کبھی جوش میں آ جاتا تو بے تحاشہ پنجابی زدہ انگریزی بولتا اور وہ بھی ایسی تیزی سے کہ الفاظ ایک دوسرے پر نادر شاہی چڑھائی کرتے سنائی دیتے اور مطلب سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے موقعوں پر اس کا مخاطب اگر کوئی شامت کا مارا ہوا امریکن ہوتا تو اس کی انگریزی کا ترجمہ عام فہم انگریزی میں ہمیں کرنا پڑتا تھا۔ البتہ جب وہ بیئر یا وھسکی کے نشہ میں مست ہوتا تو ہمیشہ پنجابی میں بات کرتا تھا اور بیچ بیچ میں اکثر ماں، بہن کی گالیاں سجاتا جاتا تھا۔ ہاں اگر ہم اس کو ٹوک دیتے تو وہ پھر ہندوستانی پر اتر آتا تھا۔ ہر سنیچر، اتوار کو پابندی سے پیتا تھا مگر ہم نے کبھی اس کو آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا تھا کہ نشہ میں بدحواس ہو کر معقول باتوں کا جواب نامعقولیت سے دے۔ اس کی مدہوشی بھی ہوش کا رنگ لئے ہوئے رہتی تھی۔

اس کیا آواز سے میرا غصہ کچھ ایسا کم نہیں ہو: ''یار جاگیرؔ! تمہیں معلوم ہے کہ پرسوں میرا امتحان ہے۔ اسی کی تیاری میں لگا ہوا ہوں۔ تمہیں اتنی صبح فون کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ ارے تم کو تو پڑھائی میں کوئی مشکل نہیں ہے مگر یہاں تو سالا دیوالہ نکلا جا رہا ہے دیوالہ! ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ اب فیل ہوئے کہ جب! آخر کیوں فون کیا تم نے صبح ہی صبح؟'' میں ایک ہی سانس میں بڑی سی تقریر کر گیا۔

اُدھر سے جاگیر سنگھؔ کی ''کھی کھی کھی'' نے حسب عادت پڑھنے لکھنے میں میری نالائقی کا جیسے اعتراف کیا۔ پھر ذرا سنبھل کر وہ سنجیدگی سے بولا:

''پُتّر! تَین کوئی دنیا دی وی کھبر اے کہ دن رات کتاباں وِچ مگج مارنا اے؟ امتحان وی ہوئی جائے گا۔ ہُنڑ ے پٹیلؔ دی بیوی دا فون آیا سی۔ کھوب رو رئی سی۔ میں اودے گر جا ریاواں۔ تو وی تیار رہ۔ میں تَینو نال لیندا جاواں گا۔''

میں نے گھبرا کر حیرت سے پوچھا: ''ونودؔ پٹیلؔ کی بیوی کا فون آیا تھا؟ کیوں کیا ہو گیا؟ کیوں رو رہی تھی؟ ونودؔ سے جھگڑا ہو گیا ہوگا اور کیا! یار ہم اس کے ذاتی معاملات

میں کیوں پڑیں؟ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ مجھ کو کیوں پھنسوا رہے ہو اس جنجال میں؟''

اس نے بڑی گمبھیر آواز میں جواب دیا جیسے موقع کی نزاکت نے اس کا نشہ ہلکا کرنا شروع کر دیا ہو:

''نئیں یار! ونودؔ نال کوئی چگڑ انئیں ہویا۔ اوتے پولس دی گل کر رئی سی۔ کوئی ہور ہی مامله لگدا اے۔ چل جاتے تکنے آں۔''

پولس کی بات کر رہی تھی؟ یہ کیا معاملہ ہے؟ میں یہی سوچ رہا تھا کہ جاگیر سنگھ نے فون رکھ دیا۔

جاگیر سنگھ سے میری ملاقات ایک ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔ مجھے امریکہ آئے ہوئے ابھی صرف دو مہینے ہی ہوئے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کئی سال لیکچرر شپ کے بعد مزید تعلیم کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا تھا۔ علی گڑھ میں اپنی دانست میں پڑھنے لکھنے میں برابر محنت کرتا رہا کرتا تھا کیونکہ اس سے امریکہ جانے میں مدد ملنے کی امید تھی۔ یوں بھی مجھے تعلیم کا شوق ہمیشہ سے تھا۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ سے جب ایک امریکن یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا تو میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا مگر اس خوشی کا غبارہ امریکہ پہنچ کر دو چار کلاسوں کی حاضری سے ہی پٹاخ سے پھوٹ گیا تھا۔ کہاں ہندوستان کی گھسی پٹی تعلیم اور رٹ کر امتحان پاس کرنا اور کہاں امریکہ کا معیار اور پروفیسروں کی علمیت! یہاں تو پڑھانے کا انداز ہی اور تھا۔ ظالم پروفیسر کلاس میں مختصر سی باتیں بتاتے جو ہمارے نزدیک آئیں بائیں شائیں کا درجہ رکھتی تھیں۔ کچھ بلیک بورڈ پر لکھ دیتے اور بیشتر کام لڑکوں پر چھوڑ کر جاتے جاتے اگلی کلاس کے لئے دس پانچ سوال دے جاتے اور سوال بھی کم بخت ایسے کہ ہلائے نہ ہلیں۔ میں اور میرے دو تین دوست ابھی مکمل طور پر حواس باختہ نہیں ہو پائے تھے کہ کسی نیک بخت اللہ کے بندے نے ہمیں جاگیر سنگھ کی جانب ہانک دیا تھا:

''جاؤ! فزکس ڈپارٹمنٹ میں جاگیر سنگھ سے ملو۔ وہ تمہاری مدد کر دے گا، ورنہ واپسی کا ٹکٹ کٹواؤ اور امریکہ کی چھٹی کرو!''

ہم لوگ دوسرے ہی دن ڈرتے ڈرتے جاگیر سنگھ سے ملنے گئے تھے۔ یوں کہئے کہ ملتے ہی سارے دلدر دور ہو گئے تھے۔ وہ تو ایسے تپاک سے ملا جیسے مدتوں کا دوست ہو۔ اس سے مل کر معجزوں پر ایمان بحال ہو گیا تھا۔ جاگیر سنگھ امرتسر کا رہنے والا کٹر سکھ تھا۔ امریکہ میں کچھ، کڑا، کیس اور کنگھے سے لیس! کرپان رکھنے کی قانون اجازت نہیں دیتا تھا ورنہ وہ بھی بغل میں رکھتا۔ چھ فٹ سے اوپر قد، بھرا بھرا جسم، کھلتا ہوا رنگ، چہرہ کا علم نہیں کیونکہ اس کا پچانوے فی صد حصہ داڑھی مونچھوں سے چھپا ہوا تھا۔ البتہ آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ فزکس میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ انتہائی ملنسار اور بے تکلف تھا! پھر اس پر مددگار ایسا کہ ہر وقت ہر شخص کی خدمت کو تیار رہتا۔ اس کی ذہانت کی دھاک پورے ڈپارٹمنٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں ہماری طرف مشہور ہے کہ ذہن و عقل کے معاملہ میں سکھ ذرا واجبی سے ہوتے ہیں۔ یار لوگوں نے سرداروں کے سیکڑوں لطیفے بھی مشہور کر رکھے تھے مگر جاگیر سنگھ سے مل کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اللہ بقیہ سارے سکھوں کی عقل سے تھوڑی تھوڑی بچا کر اس کو بخش دی تھی۔ وہ نہ صرف ہماری مشکلات حل کرتا بلکہ ماں بہن کی گالیوں کے درمیان پڑھنے لکھنے کے گُر بھی سکھاتا جاتا تھا۔ کیا پڑھا جائے، کیسے پڑھا جائے، لائبریری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھایا جائے، ایسے ہی نہ جانے کتنے چٹکلے بتاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ملتا تو ہمارے ہندوستان واپس جانے میں زیادہ عرصہ نہ لگتا!

ونود پٹیلؔ سے ہمیں جاگیر سنگھ نے ہی ملوایا تھا۔ ایک سہ پہر میرے کمرہ اپنی کھٹارہ موٹر کار لے کر آ دھمکا: ''چلو بادشاہو! آج تمہیں اپنے یار پٹیلؔ سے ملوا لاؤں۔ تم مل بھی لوگے اور گجراتی چائے بھی پی لوگے۔'' اور پھر وہ راستہ بھر اپنے دوست ونود پٹیلؔ کی باتیں کرتا رہا:

''یار وہ سالا ہے تو پٹیلؔ، پر مالوم نہیں بیوی کہاں سے مار لایا ہے۔ ایسی سندر کہ سوہنی ہے سوہنی! اگر تن پر ہاتھ رکھ دو تو پیاری کا رنگ میلا ہو جائے! ویسے بھی اب تک پُٹھ پر ہاتھ رکھنے کا سردار جاگیر سنگھ کو موکا ملا ہی کہاں ہے؟ اس سالے ونودؔ کے ساتھ تو گریب کا نصیب ہی پھوٹ گیا۔ پر وہ بیچاری کرتی بھی کیا۔ ہمارا ہندوستانی سسٹم ہی سالا ایسا ہے کہ لڑکیوں سے کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ بس پکڑا اور جھونک دیا۔''۔۔۔۔'' یہاں پہنچ کر اس نے ایک غلیظ سی گالی دے کر سانس لیا۔

''یار! تم وہاں مجھ کو اپنے دوست سے ملوانے لئے جا رہے ہو کہ اس کی بیوی کے حسن سے اپنی آنکھیں سینکنے؟ کس قدر بری بات ہے جاگیر سنگھ۔ کچھ تو شرم کرو۔ ویسے آخر یہ پٹیلؔ کرتا کیا ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

جاگیر سنگھ نے پھر ایک بڑی سی گالی دی: ''اوئے شرم دی۔۔۔۔! ارے بادشاہو، ونودؔ کرے گا کیا سالا؟ وہی جو ہر پٹیلؔ کرتا ہے۔ ایک موٹیل لے رکھا ہے۔ سارا پریوار اسی میں لگا ہوا ہے۔ سوہنی رجسٹریشن ڈیسک سنبھالتی ہے۔ ونودؔ موٹیل کی مرمت شرمت، صفائی وفائی کرتا ہے۔ سالا سنڈاس تک خود صاف کرتا ہے کہ پیسے بچیں گے اور آفس کے پیچھے دو کمروں کے اپارٹمنٹ میں اس کی ساس کھانا بناتی ہے۔ موٹیل کیا ہے بدماشی کا اڈّا ہے! لوگ عورتیں کرایہ پر لاتے ہیں اور ونودؔ کمرہ گھنٹہ کے حساب سے کرایہ پر دیتا ہے۔ دن بھر کمرہ کی چادر، تولیہ بدلتا رہتا ہے اور گاہک آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی دن پولس کو پتہ چل گیا تو بیٹا سیدھے جیل جائیں گے جیل!''

''تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ ونود پٹیلؔ سے تم ملنے نہیں جاتے ہو بلکہ اس کی بیوی کو تاکنے جاتے ہو۔ کسی دن اس نے اپنی دلالی میں تمہیں شامل ہونے کو کہا تو کیا کرو گے؟ کمرہ اور مال دونوں مفت استعمال کرنے کو مل جائیں گے۔'' میں نے شرارت سے پوچھا۔

جاگیر سنگھؔ بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا: ''اوئے، تیرا ستیاناس ہو! مخول کرتا ہے؟ ابے میں وائے گروؔ کا خالصہ ہوں۔ عورت بھی مجھ کو خالص چاہئے۔ ایسی عورتوں سے میرا کیا کام چلے گا؟''

اور چند منٹ میں اس نے ایک پارکنگ لاٹ میں کار موڑ کر روک دی۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی عمارت پر ''آفس'' کی تختی لگی ہوئی تھی اور ایک کنارے اونچا سا بورڈ راہ چلتے مسافروں کو دعوت قیام دے رہا تھا: ''گولڈن موٹیل''۔ آفس کاؤنٹر پر کھڑی عورت پر میری نظر پڑی تو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ یا اللہ! کوئی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے؟ واقعی جاگیر سنگھؔ نے اس کو سوہنی یونہی نہیں کہہ دیا تھا۔ سونا سا دمکتا ہوا رنگ، بڑی بڑی ستارہ سی آنکھیں جن سے نہ معلوم کیوں دُکھ سا جھلک رہا تھا، گلاب کی ادھ کھلی کلیوں کے سے ہونٹ، بدن سانچے میں ڈھلا ہوا جیسے بنانے والے نے اسے فرصت کے کسی لمحہ میں بنایا ہو اور چہرہ پر سادگی بھرا وہ بانکپن کہ نظر بار بار لوٹ کر پڑتی تھی۔ ایک لمحہ کو میری تو خیر حالت غیر ہو ہی گئی، جاگیر سنگھؔ بھی ہکلانے لگا: ''نمستے جی! او ونودؔ کتھے اے؟''

سوہنیؔ نے زیر لب مسکرا کر سامنے بنے موٹیل کے کمروں کی قطار کی جانب اشارہ کیا اور سریلی گھنٹی کانوں میں بج گئی:

''وہ اسٹوریج روم میں ہے۔ سامان نکالنے گیا ہے۔ اُدھر ہی ملے گا۔''

ہم لوگ آفس سے باہر نکلے تو میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جاگیر سنگھؔ بھی اپنی چوکڑی بھولے ہوئے تھا۔ موٹیل کے کمرہ نمبر گیارہ سے ملحق اسٹوریج روم میں وہ اپنے خیالوں میں گم داخل ہوا تو میں بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ سامنے ہی لگی ایک الماری سے تولیے اور چادر نکال کر ایک شخص دروازہ کی جانب پلٹ رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔ اور اس کا حلیہ دیکھ کر میری ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی!

پانچ فٹ کا گول مٹول بدن، کاندھوں سے گردن ندارد، سیاہ پکّا رنگ، گول گول بٹن سی آنکھیں، بھدے سے چہرہ پر پکوڑا سی ناک اور ماتھے پر سیندور اور چاول کا تلک لگائے، سستے سے جُھریوں دار سوٹ، ٹائی میں ملبوس وہ کسی سرکس کا مسخرہ لگ رہا تھا! اگر یہی ونود پٹیلؔ تھا تو میں قدرت کی ستم ظریفی پر ماتم کرنے کے لئے صاف ضمیر کے ساتھ تیار تھا! ابھی میں اس عجیب الخلقت شخص کو دیکھ ہی رہا تھا کہ جاگیر سنگھؔ نے میرے شک کی تصدیق کر دی:

''اوئے ونودؔ! کی حال اے؟ بہت دنوں سے درشن نہیں ہوئے تیرے۔ اے دیکھ! تجھ سے ایک دوست کو ملوانے لایا ہوں۔ یہ بھی امریکہ جھک مارنے آیا ہے۔''

ونود پٹیلؔ نے ایک مری سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر مجھ کو پرنام کیا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا، جیسے اس کو ہمارا اس طرح کمرہ میں گھس آنا پسند نہ آیا ہو۔ بار بار بغلیں جھانک رہا تھا اور ماتھے پر پسینہ کی بوندیں چمک آئی تھیں۔ اس نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور گھبرایا ہوا دروازہ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا:

''آئیں سردار جیؔ! باہر نکلیں۔ آفس چل کر چائے پیتے ہیں۔''

وہ ہمیں اسٹوریج روم سے باہر نکالنے کے لئے بے حد بے چین نظر آ رہا تھا۔ ویسے اس کمرہ میں تھا بھی کیا! ایک طرف گرد و غبار سے اَٹی ایک میز اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں دو الماریاں رکھی تھیں جن میں موٹیل کے لئے تولئے، چادریں، کمبل رکھے ہوں گے اور دوسری طرف دیوار کے سہارے لگی شیلف میں سفائی کا سامان، جھاڑن اور مرمت کے لئے مختلف سامان بے ڈھنگے پن سے لگا ہوا تھا۔ کمرہ نمبر گیارہ اور اسٹوریج روم کی درمیانی دیوار پر چار پانچ فٹ چوڑا سیاہ اور موٹا پردہ پڑا ہوا تھا جیسے اس طرف کوئی الماری وغیرہ ہو۔ کمرہ کی چھت سے لٹکا ہوا ایک ننگا بلب جل رہا تھا۔ اگر یہ بلب نہ ہوتا تو کمرہ میں گھپ اندھیرا ہوتا کیونکہ باہری دروازہ کے علاوہ کسی دیوار میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔

جاگیر سنگھؔ بھی شاید اس کمرہ میں پہلی مرتبہ آیا تھا اور داڑھی کھجا کھجا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

''اوئے یار! چلتے ہیں، سالی ایسی کیا جلدی ہے؟:۔۔۔۔: چائے کہیں بھاگ جائے گی کیا؟'' اس نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ ''ارے یہ اسٹوریج ہے کہ کال کوٹھری؟ کیا اٹر سٹر بھر رکھا ہے یہاں تو نے؟ اور یہ دیوار پر کالا پردہ کیوں ڈال رکھا ہے؟ کوئی لونڈیا چھپا رکھی ہے کیا اس کے پیچھے؟'' اس نے ونودؔ کو آنکھ مار کر کہا۔

ونودؔ کا رنگ یوں ہی اڑ رہا تھا۔ پردہ کا ذکر ہوا تو ہکلانے لگا: ''ک ک کچھ نہیں ہے یار! ب ب بس ایک کاٹھ کباڑ کی الماری ہے۔ چلو نکلے یہاں سے۔'' پھر جاگیر سنگھؔ کا ہاتھ تھام کر تقریباً ''کھینچ کر اسے اسٹوریج روم سے لے گیا۔ کمرہ میں بڑا سا تالا ڈال کر وہ لمبے لمبے قدموں سے آفس کی طرف چل دیا۔ مجھ کو جاگیر سنگھؔ کی تو خبر نہیں مگر سوہنیؔ کو ایک بار پھر دیکھنے کی خواہش میں میرے اپنے قدموں میں تو یقیناً ''تیزی پیدا ہو گئی تھی!

اس دن میں نے پہلی مرتبہ مصالحہ دار گجراتی چائے کی کڑکتی گرم پیالی پی۔ ویسے تو یہ الائچی اور دار چینی والا جوشاندہ مجھے ہرگز پسند نہ آتا لیکن جن کنول سے سفید اور نازک ہاتھوں نے چائے کی ٹرے سامنے لا کر رکھی تھی، اگر وہ زہر کا پیالہ بھی دیتے تو خدائے قدوس کی قسم! بے جھجک پی جاتا!

جاگیر سنگھؔ کار چلاتے ہوئے مستقل بولے جا رہا تھا، مگر میرا دماغ کہیں اور تھا۔ اس کی بات جیسے ایک کان سے اندر جا کر دوسرے سے سیدھی باہر نکلی جا رہی تھی۔ میرا ذہن الگ ہی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا ونود پٹیلؔ کی کس مسافر یا دھندے کے گاہک سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ پولس کو اطلاع ملی ہو کہ ہوٹیل میں راہ چلتے مسافروں کی رہائش کے علاوہ وہ کچھ بھی ہوتا تھا جس کو دنیا کا سب سے پرانا پیشہ کہا جاتا ہے۔ یا پھر اس پولس کے سپاہی کو ونودؔ کی کوئی باپسند نہیں آئی تھی جو ماہانہ دستوری کے عوض موٹیل کے اس دھندے سے چشم پوشی برتا کرتا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اس کا جھگڑا سوہنیؔ سے ہو گیا ہو۔ امریکہ میں پولس آئے دن گھریلو جھگڑوں میں الجھا کرتی ہے اور مظلوم عورتوں کو ان کے شوہروں سے ہرجانہ یا رہائی دلوانے کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔ مگر یہ آخری بات کچھ دل کو لگتی نہیں تھی۔ ونودؔ ایسا بے وقوف نہیں تھا کہ اپنی ایسی سوہنی بیوی سے جھگڑا کر کے اپنے شب و روز کو دوزخ کا نمونہ بنا دیتا۔ میرا دل سوہنیؔ کی ستارہ سی آنکھوں میں آنسوؤں کے تصور سے ہی بے چین سا تھا۔

ہو نہ ہو یہ جھگڑا پیسوں کا ہی تھا۔ ہم دیسی لوگ امریکہ آ کر پیسوں کو دانت سے پکڑتے ہیں اور ان کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ خود روکھی سوکھی کھاتے ہیں، ٹوٹی پھوٹی کار چلاتے ہیں، سستے مکان میں گذر بسر کر لیتے ہیں اور بینک میں دن رات بڑھتے ہوئے ڈالر دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ جاگیر سنگھؔ نے پچھلے دنوں ہی تو بتایا تھا کہ سال بھر پہلے ونودؔ کے کہنے سننے سے اس کی ماں احمد آبادؔ سے امریکہ چلی آئی تھی مگر پھر یہاں کی مشینی زندگی اور جان لیوا تنہائی سے گھبرا کر ایک ماہ ہی میں واپس چلی گئی تھی۔ جس دن سے وہ واپس گئی تھی ونودؔ اس کو برا بھلا ہی کہتا رہتا تھا:

''یارؔ! آئی تھی امریکہ تو رہ لیتی یہاں۔ دو دن میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ میرا دو ہجار ڈالر کا نکسان کر گئی۔ میں نے ویجا بنوایا، ٹکٹ کٹوایا، ارے نیویارکؔ تک اس کو لینے گیا اور وہ ایک ماہ میں بھاگ گئی! دو ہجار ڈالر! باپ رے باپ! اتنے ڈالر کماتے کماتے کتنا سمے لگے گا اب؟''

ضرور ڈالروں کا ہی کوئی چکر ہوگا۔ میں ابھی اس فیصلہ پر پہنچا ہی تھا کہ جاگیر سنگھؔ نے کار ''گولڈن موٹیلؔ'' کے آفس کے سامنے کھڑی کر دی۔ وہاں تہ کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا اور معاملہ واقعی گمبھیر معلوم ہوتا تھا۔

پولس کی ایک کار کی پچھلی سیٹ پر کلائیوں میں ہتھکڑیاں پہنے ونود پٹیلؔ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ پسینہ سے اس کے ماتھے کا سیندوری ٹیکا بہہ کر اس کی ناک پر اتر آیا تھا۔ آفس کے باہر سوہنیؔ کھڑی دھاروں دھار رو رہی تھی اور اس کے قریب ہی کھڑی اس کی ماں رو رو کر گجراتی میں مستقل بین کر رہی تھی۔ سوہنیؔ کے قریب کھڑا ایک پولس افسر اس کو ہوس آمیز ہمدردی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس کی ہر سسکی پر اپنا سر ہلا کر بظاہر اس کے غم میں شریک ہونے کا ناٹک کھیل رہا تھا۔ دوسری طرف کمرہ نمبر گیارہ سے ملحق اسٹوریج روم کا دروازہ چورس کھلا ہوا تھا اور پولس کے دو سپاہی اور کیمرہ ہاتھ میں لٹکائے ہوئے ایک پولس فوٹو گرافر اسی وقت باہر آئے تھے۔ اسٹوریج روم اور کمرہ نمبر گیارہ کے دروازوں پر پولس نے پیلا ٹیپ لگا کر عام آمد و رفت کی راہیں روک دی تھیں۔ کچھ ہی دور کھڑی ایک امریکن عورت ایک پولس والے سے جلدی جلدی کچھ کہہ رہی تھی جسے وہ ایک نوٹ بک میں لکھتا جا رہا تھا۔

پولس! سوہنیؔ! ہتھکڑی! فوٹو گرافر! میرے ذہن نے چند لمحوں میں کئی قلابازیاں کھا لیں۔ بھلا اسٹوریج روم میں تھا ہی کیا جو پولس اس کی تصویریں کھینچ رہی تھی؟ کاٹھ کباڑ اور کچھ پرانا فرنیچر۔ اس کے علاوہ وہاں تھا ہی کیا؟ کوئی قتل تو نہیں ہو گیا وہاں؟ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ جاگیر سنگھؔ نے بڑھ کر سوہنیؔ سے سوال کیا:

''بھابھی جی! کی گل اے؟ پٹیلؔ نوں پولس کیوں پھڑیا؟''

سوہنیؔ نے اپنی ستارہ سی آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر جاگیر سنگھؔ کو دیکھا تو اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ فوراً سنبھل کر ہندی میں بولا:

''میرا مطلب یہ ہے کہ بھابھی جی کیا ہوا؟ یہ کیا دنگا ہو رہا ہے یہاں؟ پٹیلؔ نے کیا جرم کیا ہے جو پولس نے پکڑ رکھا ہے اسے؟''

سوہنیؔ نے کچھ کہنے کے لئے منھ کھولا اور پھر میری جانب دیکھ کر چپ ہو گئی جیسے وہ یہ راز کی بات سب کے سامنے کہنے کو تیار نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو بات مناسب بھی تھی۔ ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت بھی کی تھی؟ میں نے موقع کی نزاکت دیکھ کر جاگیر سنگھؔ سے کہا: ''تم لوگ آفس میں چلے جاؤ۔ یہاں سب طرح کے لوگ ہیں!''

ادھر وہ دونوں موٹیل کے دفتر میں گئے اور اِدھر میں پولس والے سے پوچھ کر ونود پٹیلؔ کی طرف کھسک گیا جو اب اپنی بٹن جیسی آنکھیں جھپکا جھپکا کر بڑی بیچارگی سے مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہمدردانہ لہجہ میں اس سے پوچھا: ''پٹیلؔ صاحب! کوئی مدد کر سکتا ہوں تو بتائیے۔ ویسے تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں یہاں نیا آیا ہوں۔''

وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور منمنا کر بولا: ''راجؔ ساب! جرا میرے وکیل کو پھون کر دو۔ بڑی کرپا ہوگی۔ آ کر وہ اور کچھ نہیں تو میری جمانت کرا دے گا۔ بتاؤں اس کا پھون نمبر؟ آفس سے ہی پھون کر دیں تو وہ جلدی سے آ جائے گا۔''

میں نے نمبر لے کر اس کو دلاسا دیا اور وکیل کو فون کرنے موٹیل کے آفس میں گیا۔ جاگیر سنگھؔ اور سوہنیؔ کونہ میں پڑے صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سوہنیؔ شاید پورا واقعہ سنا چکی تھی کیونکہ جاگیر سنگھؔ صوفہ پر اپنا سر پکڑے بیٹھا منھ ہی منھ میں گالیاں بڑبڑا رہا تھا۔ چہرہ ایسا فق تھا کہ داڑھی مونچھ کے ہوتے ہوئے بھی اس کی پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''اوئے ترا کھانہ کھراب او! اے کی کیتا ای؟ ہُن کی ہوئے گا؟ اے کم کرن دے پہلے اپنے کرداکھیال کیتا ہوندا!''

وہ دیر تک ایسے ہی بیٹھا رہا۔ وکیل نے موٹیل فوراً ''پہنچنے کا وعدہ کیا اور ہم لوگ اس کے آنے تک وہیں ٹھیرے رہے۔ دراصل ٹھیرا تو صرف میں رہا۔ جاگیر سنگھؔ تو مستقل ونود پٹیلؔ کو اس کے سارے خاندان سمیت پنجابی میں سڑی سڑی گالیاں دیتا رہا۔ اور سوہنیؔ ریشمی رومال میں منھ چھپائے سسکیاں لیتی رہی۔ وکیل آیا تو جاگیر سنگھؔ نے اس کو الگ لے جا کر سارا قصہ سنایا۔ پھر مجھے اشارہ سے کار کی جانب بلا کر دھڑاک سے اس میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ پھر چھوٹتے ہی گالی دے کر بولا:

''اوئے، تیری :۔۔۔۔۔: حرام جدگی کرنی سی تے کدرے ہور کردا۔ اے تو پٹیلؔ اے نا! مت ماری گئی سی سالے دی!''

میں اب بالکل تنگ آ گیا تھا۔ جاگیر سنگھؔ مجھے راز کی بات بتانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا یا شاید اس کو ماں، بہن کی گالیاں دینے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ لمحہ بھر کو وہ تھما تو میں نے پوچھا: ''یار! تم مجھ کو کچھ بتاؤ گے کہ بس گالیاں ہی دیتے رہو گے؟ آخر پٹیلؔ نے ایسا کیا کام کیا جو ہتھکڑیاں لگ گئیں اس کو؟''

''اوئے، وہ سالا اب جیل جائے گا جیل! ہتھکڑی تو اس کی کسمت بن گئی ہے۔ ارے :۔۔۔۔۔: جیل جائے یا مرے سالا، اپن سے کیا؟ پر اب سوہنیؔ کا کیا ہوگا؟''

میں جھنجھلا ہی تو گیا: ''حد کر دی تم نے یار! ارے یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟ پھر سوہنیؔ کا بھی انتظام کر دینا۔''

وہ اک دم سنجیدہ ہو کر بولا: ''سچ بتاؤ راجؔ! تم سوچ سکتے ہو کہ سالے پٹیلؔ جیسا کوئی بھوت سوہنیؔ ایسی بیوی پا کر ایسی بات کرے گا؟''

میں نے بڑی بیچارگی سے اس کو دیکھا: ''ارے کیسی بات؟ تم بتاتے تو ہو نہیں، بس گالیوں پر گالیاں دئے جا رہے ہو!''

جاگیر سنگھؔ نے کہا: ''اس سالے پٹیلؔ نے اسٹوریج روم کی دیوار میں کالے پردہ کے پیچھے TWO-WAY MIRROR* لگا رکھا تھا اور اس میں سے کمرہ نمبر گیارہ میں کرایہ دار عورتوں کو کپڑے بدلتے اور دنیا کے دھندے کرتے ننگا دیکھتا تھا۔ جبھی تو سالا کمرہ کال کوٹھری بنا رکھا تھا۔ گھر میں سوہنیؔ رکھی تھی اور سالا چھپ چھپ کر رنڈیوں کا ناٹک دیکھتا تھا۔ دھت تیری کی!''

میرا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا: ''ایں! TWO-WAY MIRROR لگا رکھا تھا؟ باپ رے باپ! ہمت تو دیکھو۔ مگر سالا پکڑا کیسے گیا؟''

جاگیر سنگھؔ میرے سوال پر بے اختیار ایسے زور سے قہقہہ مار کر ہنسا کہ کار سڑک پر بے قابو ہو کر لہرا گئی۔ دیر تک وہ قہقہہ قہقہہ ہنستا رہا۔ پھر ذرا رک کر بولا:

''ارے وہ حرامی کل رات اسٹوریج روم میں چھپا کمرہ نمبر گیارہ کا ننگا ناٹک دیکھ رہا تھا کہ بھول گیا کہ کہاں کھڑا ہے۔ سالے نے بھولے سے سگرٹ سلگانے کے لئے ماچس جلا لی اور دوسری طرف سے لونڈیا نے آئینہ میں اس کی چمک دکھ لی! اب گیا جیل کئی سال کے لئے۔ مگر یار پتہ نہیں اب سوہنیؔ کا کیا ہوگا؟'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

ہمیں آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ سوہنیؔ کہاں چلی گئی۔ ونود پٹیلؔ سات سال کی جیک کاٹ رہا ہے۔ گولڈن موٹیلؔ بکاؤ ہے اور سنا ہے کہ ایک اور پٹیلؔ اس کو خریدنے کے چکر میں ہے۔ آخر ہوٹیل، موٹیل اور پٹیل کا گھن چکر بھی تو ضروری ہے!

---

*TWO-WAY MIRROR ایک خاص قسم کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس کے پیچھے گھپ اندھیرا ہو تو سامنے سے عام آئینہ کی طرح نظر آتا ہے اور ویسے ہی کام بھی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آئینہ کے پیچھے اندھیرے میں کھڑے شخص کو دوسری طرف کی ہر چیز صاف دکھائی دیتی ہے، جیسے شفاف شیشہ لگا ہوا ہو۔ البتہ اگر اس آئینہ کے پیچھے روشنی ہو تو سامنے کھڑے شخص کو شیشہ کے آر پار وہ روشنی صاف نظر آ جاتی ہے۔ چنانچہ اس طرح کے آئینہ کے خفیہ استعمال کے لئے اس کے پیچھے مکمل اندھیرا ہونا لازمی ہے۔

بھگوان کی مایا

سائیں باؔبا کے مندر پر روزانہ کی طرح آج بھی بھگتوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ مہاراج شردھانند جؔی پرم ہنس کی شہر میں آمد کی خبر چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ دور دور سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں وہاں پہنچ رہے تھے۔ آس پاس کے قصبوں اور گاؤں سے بسیں، ٹرینیں اور ٹیکسیاں لوگوں سے لدی پھندی آ رہی تھیں۔ سیکڑوں گاؤں والے بیل گاڑیوں پر آئے تھے اور مہاراج کے درشن کے پیاسے مندر کے آس پاس میدان میں ڈیرہ ڈالے ہوئے پڑے تھے۔ میلوں دور تک میلہ کا سا سماں بندھ گیا تھا۔ بیوپاری تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہی ہیں، چنانچہ انہوں نے سڑک کے دونوں طرف ایک ایک میل تک دوکانیں لگا لی تھیں۔ کہیں ڈھاک کے پتوں کے پیکٹ میں گیندا، بیلا اور گلاب کے پھول بک رہے تھے تو کہیں بتاشوں، تال مکھانوں اور مٹھائی کی دوکانیں سجی ہوئی تھیں۔ اِدھر سبزی، ترکاری کی دوکانوں پر کنجڑوں نے ناریل خاص طور سے سجا رکھے تھے کہ بھگوان کے چڑھاوے میں مٹھائی اور ہار پھول کے ساتھ ناریل بھی تو ضروری تھا! اُدھر مندر سے ذرا ہٹ کر کپڑے، پلاسٹک کے جوتے، چپل اور برتنوں کی دوکانیں لگی ہوئی تھیں۔ قریب ہی بچوں کی تفریح کے لئے ہنڈولے اور چرخی لگی ہوئی تھیں۔ ماں باپ تو مندر میں سائیں باؔبا کی مورتی اور مہاراج شردھانند جؔی کے درشن اور آشیرواد کے لئے چلے جاتے تھے اور بچے ہنڈولے، جھولے اور چرخی کے مزے لیتے رہتے تھے، چرخ چوں! چرخ چوں!

مہاراج جؔی دنیا کے ان ہنگاموں سے الگ تھلگ مندر کے چبوترہ پر سائیں باؔبا کی مورتی سے ذرا سا ہٹ کر آسن لگائے بیٹھے ہوئے دھیان میں مگن تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں اور ماتھے پر ترسول نما صندلی تلک جگمگا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر ان کے دس بارہ سیوک ہاتھ جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ لائن لگائے آہستہ آہستہ مندر میں داخل ہوتے، مہاراج جؔی کے درشن سے فیضیاب ہو کر دور سے ہی پرنام کرتے اور ایک کنارے بیٹھے سیوک کو مناسب دکچھنا دیتے ہوئے دوسرے دروازہ کی جانب چلے جاتے تھے جہاں مہاراؔج کی طرف سے پرساد بانٹا جا رہا تھا۔

دراصل مہاراج جؔی کو خود تو روپے کا کوئی لوبھ تھا نہیں۔ ساری دنیا کو معلوم تھا کہ ان کی ساری ضروریات بھگوان وشؔنو کے یم دوت راتوں رات پوری کر دیا کرتے تھے۔ وہ کھاتے پیتے تو ویسے بھی کم ہی تھے۔ چھ چھ مہینے تو آسن لگائے، دھونی رمائے، مون دھارن کئے، کھانے پینے اور بولنے چالنے سے بے نیاز بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے سیوکوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے مہاراج جؔی کے کمرہ میں یم دوت اترتے دیکھے تھے جو ان کے اشارہ پر دنیا کے کام کر دیا کرتے تھے۔ روزانہ صبح اور رات گئے دیوداسیاں ان کے اپنے ہاتھوں سے بھوجن کرواتی تھیں اور تان پورہ پر بھجن گا گا کر سناتی تھیں۔ مہاراج شردھانؔند جی اتنے پہنچے ہوئے تھے کہ ان کا آشیرواد خالی نہیں جاتا تھا۔ سیکڑوں عورتوں کی برسوں کی خالی گود آپ کے ایک اشارہ میں بھر گئی تھی اور لاکھوں کی منوکامنا آپ کی ایک نگاہ کے اٹھتے ہی پوری ہو گئی تھی۔ مہاراج جؔی نے ہری دوؔار کی برفیلی پہاڑیوں میں تیس سال جو تپسیا کی تھی، یہ سب اسی کا پھل تھا۔

ظاہر ہے کہ بھگوان وشؔنو کے ایسے بھگت کو روپیوں پیسوں اور دنیا کے دوسرے جنجال کی فکر کیسے ہو سکتی تھی مگر ان کے سیوکوں اور سیوکاؤں کا پالن تو پھر بھی کرنا ہی تھا۔ پھر ہری دوؔار میں مہاراؔج بھگوان وشؔنو کا جو عظیم الشان مندر بنانا چاہتے تھے اس کے لئے تو روپے چاہئے تھے! اس مندر کی ایک خوبصورت سی بڑی تصویر سائیں باؔبا کے مندر کے باہر لگی ہوئی تھی۔ لوگ آ آ کر دیکھتے تھے اور سادر پرنام کرنے کے بعد پاس ہی رکھے مقفل صندوق کی جھری میں اپنے دھرم اور توفیق کے مطابق دکچھنا ڈال دیتے تھے۔ لوگوں کے اصرار پر مہاراج جؔی نے بہ حالتِ مجبوری یہ قبول کر لیا تھا کہ ان کے ذاتی آشیرواد لینے والے اپنی مرضی سے اس مندر کی تعمیر کے لئے جو دینا چاہیں دے سکتے تھے۔ ان کے پاس پوجا پاٹھ سے جو وقت بچ جاتا تھا اس میں سے تین گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام انہوں نے اس نیک کام کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ لوگوں کی سہولت کے لئے ان کے سیوکوں نے دان دکچھنا دینے والوں کی تین لائنوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک لائن ایسے لوگوں کی تھی جو مہاراؔج کے چرن کمل اپنے پاپی ہاتھوں سے چھونے کی خوشی میں پانچ سو روپوں کی دکچھنا دیتے تھے۔ دوسری لائن میں وہ لوگ ہوتے تھے جو ان کے تخت کے پایوں کو چھو کر اور دو سو روپوں کا نذرانہ پیش کر کے جیتے جی سورگ کا مزا چکھ لیتے تھے۔ اور تیسری قطار ایسے بھگتوں کی

تھی جو پچاس روپے دے کر مہاراج جیؔ کے تخت سے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں پر مستک ٹیک سکتے تھے۔ بھگوان کو خوش کرنے کا اس سے سستا نسخہ اور کہاں مل سکتا تھا!

سچ تو ہی ہے کہ سائیں باباؔ کے مندر کی رونق مہاراج شردھانند پرم ہنسؔ کی آمد سے سوگُنا ہوگئی تھی۔ ساری فضا پر بھگتوں کی بے پناہ عقیدت اور مہاراج جیؔ کی مہامایا نے مل کر ایک مستی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ لوبان اور اگربتی کی بھینی بھینی خوشبو سے ہوا مہک رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تخت کے دونوں طرف بیٹھے سیوک اٹھ کر زور سے شنکھ بجاتے، ایک سیوک اٹھ کر چھت سے لٹکا ہوا چمکدار پیتل کا گھنٹا ٹناٹن، ٹناٹن بجاتا اور ان کے بیٹھتے ہی ایک اور سیوک گرج دار آواز میں آواز لگاتا: ''بولو شری وشنو دیو جیؔ کی۔۔'' اور ہزاروں گلے فلک شگاف آواز سے جواب دیتے: ''جے ے ے ے!''

''بولو شری رام چندر جیؔ کی۔۔۔۔'' جے ے ے ے!

''بولو شری بھولے ناتھ کی۔۔۔۔'' جے ے ے ے!

اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد مہاراج جیؔ اپنی سمادھی پر بیٹھے بیٹھے اپنی غلافی، سرخی مائل آنکھیں کھول کر اپنے بھگتوں کو ہاتھ اٹھا کر اشارے سے آشیرواد دیتے اور دوبارہ مراقبہ میں چلے جاتے!

لالہ سری رامؔ مہیشوری ادھر اپنے اکلوتے بیٹے پرسرام مہیشوریؔ کی طرف سے کافی پریشان رہا کرتے تھے۔ ویسے بیٹا پڑھا لکھا، ایم اے پاس خوش شکل اور صحت مند تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی وہ ریل پیل تھی کہ بقول شخصے ہُن برس رہا تھا۔ لالہ سری رامؔ شہر کے سب سے بڑے صراف تھے۔ چوک ملونی گنج میں ان کی سونے چاندی کے زیورات کی بہت بڑی دوکان تھی۔ دلّی، بمبئیؔ اور کلکتہؔ تک بیوپار کا جال پھیلا ہوا تھا اور شہر میں تو ان کی ٹکر کا کوئی تھا ہی نہیں۔ بھگوان نے لالہ جیؔ کو اولاد کی طرف سے بھی سکھ دیا تھا۔ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر آباد، ہنسی خوشی دن بتا رہی تھیں۔ پرسرامؔ اگرچہ اکلوتا بیٹا تھا مگر کسی بری عادت میں نہیں پڑا تھا حالانکہ ایسی بے پناہ دولت اپنے ساتھ جہاں اور روگ لاتی ہے وہاں عیاشی اور بدچلنی سب سے پہلے آتی ہیں۔ پرسرام پر دولت کی بہتات نے ایسا کوئی خراب اثر نہیں ڈالا تھا۔ بس اچھا پہننے اور بڑھیا کار چلانے کا شوق تھا تو یہ ایسی کون سی بڑی بات تھی! اور اس شوق میں خرابی ہی کون سی تھی جو لالہ جیؔ فکر مند ہوتے؟

دراصل لالہ سری رامؔ اپنے بیٹے کی آزاد خیالی سے پریشان تھے۔ پڑھ لکھ کر وہ ان سب چیزوں سے بیگانہ ہو کر رہ گیا تھا جو لالہ جیؔ کے نزدیک اہم تھیں۔ بیوپار کی طرف اس کا دھیان بالکل ہی نہیں تھا اور لالہ جیؔ کو فکر تھی کہ ان کے بعد کروڑوں کا بزنس اور جائداد کا کیا ہوگا۔ سب سے زیادہ پریشانی انہیں پرسرامؔ کی دھرم سے بے پرواہی سے تھی۔ وہ نہ تو لالہ جیؔ طرح روزانہ صبح اشنان کر کے جپ جیؔ کا پاٹھ کرتا تھا اور نہ ہی مندر جاتا تھا۔ وہ پوجا پاٹھ اور پنڈتوں کی آؤ بھگت سے صرف بچتا ہی نہیں تھا بلکہ موقع بے موقع ان کی کھلے عام مخالفت بھی کرتا رہتا تھا۔ باپ سے تو وہ کچھ زیادہ نہیں کہتا تھا لیکن ماں اگر کبھی محبت سے اس کو پوجا اور دھرم کی ترغیب دیتی تو وہ ہنس دیتا:

''ارے اماںؔ! یہ سب فراڈ ہے فراڈ! یہ پنڈت لوگ باپوؔ کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ایسے ہی بھگوان کے سیوک ہوتے تو رس گلے کھا کھا کر اتنے موٹے ہونے کی بجائے بھوکوں، ننگوں کی سیوا نہ کرتے جس سے غریبوں کا بھلا ہوتا؟''

''ماںؔ! تم خود ہی سوچو۔ یہ مٹی پتھر کے بھگوان ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟ ان کے کپڑے تک تو تم بدلواتی ہو! یہ بھلا کسی کی مدد کیا کر سکتے ہیں؟''

''باپوؔ جو مندر میں اتنا پیسہ دیتے ہیں اس سے کوئی دھرم شالہ یا اناتھ آلیہ بنا دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ کہیں کوئی بچوں کا اسپتال کھول دیتے۔ لوگوں کو سکھ ملتا، ٹھیک ہے نا؟''

مامتا کی ماری ماںؔ اس کی سنتی اور ایک گہری سانس لے کر چپ ہو جاتی۔ بیٹا کہتا تو ٹھیک ہی تھا مگر کوئی دھرم اور شاستروں کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ پرکھوں سے جو کام چلا آ رہا تھا اسے کوئی مٹا تو نہیں سکتا تھا! بیٹے کو سمجھاتی بجھاتی اور پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی کہ شادی ہوگی اور دنیا سنبھالے گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ لالہ جیؔ اپنی پتنی کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کالج کی تعلیم اور بری صحبت نے پرسرامؔ کے دماغ میں تھوڑا سا فتور پیدا کر دیا تھا۔ جس بھگوان نے اس کو یہ بیماری دی تھی وہی اس کو دور بھی کر سکتا تھا۔ لالہ جیؔ نے یہ سوچ کر اپنی پوجا پاٹھ اور گیان دھیان کو اور بڑھا دیا تھا۔

آج منگلوار کا شبھ دن تھا یہ دن سائیں باباؔ کے مندر بلکہ سارے شہر کے لئے نہایت مبارک دن تھا کیونکہ اس شام کو سورج ڈھلنے کے بعد آرتی پوجا سے فارغ ہو کر مہاراں شردھانندؔ جی پرم ہنسؔ چند خوش قسمت بھگتوں کو بھینٹ کی اجازت سرفراز کرتے تھے۔ وہ خود تو ساری دنیا کو مایا جال سمجھتے ہی تھے چنانچہ دولت کی تمنا ان کو چھو کر بھی نہیں گذری تھی۔ ہاں ان کے سیوک ہری دوار میں بننے والے وشنو مندر کی تعمیر کے سلسلہ سے اور وہاں جانے والے یاتریوں کی سیوا کی خاطر ان بھگتوں سے حسب حیثیت دکچھنا کی

سفارش کیا کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو یہ سودا کچھ ایسا مہنگا نہیں تھا۔ ایک تو پانچ سات ہزار روپے کے بدلے مندر بنوانے والوں میں نام لکھ لیا جاتا تھا جو سورگ کے ٹکٹ کے برابر تھا۔ پھر مہاراج جیؔ ایسے مہان پرش سے روبرو ملاقات اور ان کے چرن کمل چھونے کی بیش بہا سعادت بھی ملتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو آپ کسی خوش نصیب کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد بھی دے دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان ملاقاتوں میں ہر بھگت کو مہاراج جیؔ اپنی روحانی قوت سے حاصل کی ہوئی ایک گھڑی بھی عنایت کیا کرتے تھے۔ وہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ مہاراج جیؔ اپنی سرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں دم بھر کے لئے بند کر لیتے، ان کے ہونٹ چند پوتر اشلوک آہستہ آہستہ پڑھتے اور وہ پھر اپنا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف لہرا کر بھگت کی جانب بڑھاتے تو اس کی مٹھی میں ایچ ایم ٹیؔ (Hindustan Machine Tools) کی ایک نئی نویلی گھڑی ہوتی! مشہور تھا کہ پرلوک سے مہاراج جیؔ کے خادم یم دوت یہ گھڑیاں لا کر انہیں دے جاتے تھے۔ ان یم دوتوں کو کسی نے دیکھا تو نہیں تھا مگر وہ ہر پاپی آدمی کو دکھائی بھی تو نہیں دے سکتے تھے!

لالہ سری رامؔ مہیشوری مندر پہنچے تو مہاراج جیؔ تخت پر سجی اپنی گدی پر براجمان ہو چکے تھے۔ ان کا تلک دھاری نورانی چہرہ لمبی لمبی جٹائیں اور گھنی داڑھی کے فریم میں بہت رعب دار لگ رہا تھا۔ مندر کی روحانی فضا، مہاراج کی مہان ہستی، شام کا سہانا سمے، ہارمونیم، ڈھولک اور مجیرے پر بھجن گاتے ہوئے بھگت، سب نے مل کر عجیب سرخوشی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ لوگ ادھر اُدھر آنکھیں میچے، بھگوان سے دھیان لگائے جھوم رہے تھے اور کچھ لوگ بے خودی کی حالت میں راگیوں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی بھجن گا رہے تھے۔ لالہ سری رامؔ اور اپنی ماں کے کہنے پر پرسرامؔ بھی ان کے ساتھ اس شام مندر آ گیا تھا اور ایک طرف دری پر بیٹھا بے دلی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں بھجن ختم ہوا۔ مہاراج جیؔ نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر بڑی میٹھی مسکان جھلک رہی تھی۔ ایک سیوک نے ہاتھ جوڑ کر ان کو پرنام کیا اور حکم کا منتظر کھڑا ہو گیا۔ مہاراؔج نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ الٹے پیر لوگوں میں واپس آ گیا۔ چاروں طرف پراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا اور لوگ کچھ عقیدت، کچھ رشک اور کچھ خوف سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے جن کو آج مہاراؔج کی ذاتی بھینٹ کی عزت ملنے والی تھی۔ ایک ایک کر کے بھگوان کے یہ خاص پریمی ہاتھ جوڑ کر بڑھتے تھے۔ ایک سیوک انہیں اپنے ساتھ مہاراؔج کے تخت تک لے جاتا تھا اور بھگت مہاراؔج کے چرن کنول کانپتے ہاتھوں سے چھو کر ہاتھ جوڑ کر ان کے حضور کھڑا ہو جاتا تھا۔ مہاراؔج اس سے دبے دبے الفاظ میں چند باتیں کرے، ہاتھ اٹھا کر آشیرواد دیتے اور مٹھی کھولتے تو اس میں سے ایچ ایم ٹیؔ کی شاندار گھڑی چمک چمک کر بھگوان کی مایا کا اعلان کرتی نظر آتی تھی!

لالہ سری رامؔ اپنی باری آنے پر بڑھے تو بے دلی سے پرسرامؔ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ لالہ جیؔ نے مہاراؔج کے چرنوں میں اپنا مستک ٹیک دیا اور ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے، مگر پرسرامؔ نے سوائے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے اور کچھ نہیں کیا۔

مہاراج جیؔ نے بڑی گمبھیرتا سے لالہ جیؔ کو دیکھ کر گنگناتی ہوئی آواز میں پوچھا: ''بولو بیٹا! تمہیں کیا کشٹ ہے؟''

لالہ جیؔ نے کانپتی آواز میں عرض کی: ''ہے مہاراؔج! بھگوان کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ پرنتو مجھے دکھ ہے کہ میرا بیٹا دھرم سے بالکل لگاؤ نہیں رکھتا ہے۔ اس کو آشیرواد دیجئے کہ اس کے من میں بھگوان کا پریم بھاؤ پیدا ہو جائے!''

مہاراج جیؔ دھیمے سے مسکرائے۔ انہوں نے پرسرامؔ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور خود آنکھیں بند کر کے چند لمحوں کے لئے گیان دھیان کی پراسرار دنیا میں چلے گئے۔ چاروں طرف موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا اور سیکڑوں آنکھیں مہاراج جیؔ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ایک گہری سانس لے کر مہاراؔج نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ بڑھا کر پرسرامؔ کے سر پر رکھ دیا۔ پھر انہوں نے کالی منکوں والی مالا والا ہاتھ آسمان کی طرف لہرا کر مٹھی کھولی تو اس میں ایچ ایم ٹیؔ کی دلہن ایسی سنہری گھڑی دمک رہی تھی۔ کمال محبت سے وہ گھڑی مہاراج نے پرسرامؔ کے ہاتھ میں تھما دی۔

ایک طرف سے ایک سیوک نے آواز لگائی: ''بولو ہر ہر مہادیو کی۔۔۔'' اور مندر بھگوان کے پریمیوں کی آواز سے گونج اٹھا: ''جے ے ے ے!''

مہاراؔج نے پرسرامؔ سے کہا: ''بچہ! بھگوان کی مایا تو آکاش اور دھرتی پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کی شکتی اتھاہ ہے۔ ہم تمہیں آشیرواد دیتے ہیں کہ تم بھگوان سے ایسا پریم کرنے لگو تمہارے ماتا، پتا تم سے کرتے ہیں!''

پرسرامؔ نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا: ''مہاراؔج! آپ کی آگیا ہو تو ایک بات پوچھوں؟''

مہاراؔج نے مسکرا کر بڑے پریم بھاؤ سے پوچھا: ''بول بچہ! کیا پوچھتا ہے؟''

پرسرامؔ نے کہا: ''مہاراؔج! بھگوان تو انتریامی ہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتے ہیں؟''

مہاراؔج نے محبت سے جواب دیا: ''ستیہ ہے بچہ، بالکل ستیہ ہے! بھگوان وشنوؔ کے لئے ہر کام سمبھو ہے۔ سارا سنسار ان کی انگلیوں پر ناچتا ہے۔ بول کیا مانگتا ہے؟''

پرسرؔام کے چہرہ پر عجیب سی پراسرار مسکراہٹ آ گئی۔اس نے مہاراؔج کی غلافی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:''مہاراؔج! آپ اپنی مہان شکتی سے کام لے کر بھگوان سے میرے لئے ایچ ایم ٹؔی کی گھڑی کی بجائے ایک جاپانی سیؔکو (SEICO) گھڑی دلوا دیجئے۔ایچ ایم ٹؔی کی گھڑی تو میرے پاس ہی!''

اڑا اڑا دھم!! مہاراج شردھانؔند پرم ہنس ایسے ہکا بکا ہو کر رہ گئے جیسے پرسرؔام نے ان کے منھ پر زنّاٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔وہ یک لخت اٹھے اور لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے مندر کے اندر غائب ہو گئے۔چاروں طرف کھڑے ہوئے بھگوان وشنو کے بھگت اور مہاراج کے عقیدت مند حیرت اور خوف سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتے دیکھتے رہ گئے!

پرسرؔام نے ہاتھ بڑھا کر ایچ ایم ٹؔی کی سنہری گھڑی مہاراج جؔی کی خالی گدی پر پھینک دی اور پلٹ کر مسکراتا ہوا مندر سے نکل گیا!

تیسرا ہاتھ

تسنیمؔ بڑی دیر سے ناشتہ کی میز پر گُم سُم بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے رکھی چائے کی پیالی کب کی ٹھنڈی برف ہو چکی تھی۔ مختلف پلیٹوں میں رکھا ناشتہ یوں ہی پڑا ہوا تھا۔ بادل نخواستہ تسنیمؔ نے دو چار چمچے اِدھر اُدھر مارے بھی تھے اور پھر اس کھیل سے اکتا کر اپنے خیالات میں گم ہو گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں ٹھوڑی رکھے، کہنیاں میز پر ٹیکے وہ خلاء میں مستقل گھورے جا رہی تھی۔ اداس چہرہ، بکھرے ہوئے بال اور سرخی مائل بے نور آنکھیں زبانِ حال سے اس گذری ہوئی رات کا فسانہ کہہ رہی تھیں جسے اس نے مسہری پر تنہا کروٹیں بدل بدل کر کاٹا تھا۔ وہ گرم آنسو اور گھٹی گھٹی آہیں جو ایسی راتوں میں اس کی ساتھی ہوا کرتی تھیں اس کے تکیہ کی گہرائیوں میں جذب ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ اور وہ تھی کہ تنہا بیٹھی آنگن کی پرلی دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔ نوکر چاکر بھی حالات دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے اور گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

آج بھی نوازؔ گھر نہیں تھا۔ پچھلی رات فون پر اطلاع دے دی تھی کہ وہ دوکان سے ہی اوم پرکاشؔ کے گھر چلا جائے گا جہاں چند دوستوں کے ساتھ اس کا تاش کھیلنے کا پرگرام تھا، اور زیادہ دیر ہو جانے پر وہ وہیں رہ جائے گا۔ یہ تاش کی محفلیں اور رات بھر گھر سے باہر گذارنا شروع شروع میں مہینہ میں ایک آدھ مرتبہ کا معمول تھا۔ دوسری صبح نوازؔ گھر آتا تو چہرہ سے جھجک اور لہجہ سے جھینپ ظاہر ہوتی۔ بات کرتا تو ایسے جیسے اپنی اس حرکت پر افسوس ہو:

''تسنیم! کیا کہوں، کم بخت رات بہت ہو گئی تھی۔ تمہیں اتنی رات گئے آ کر کیا جگاتا۔ پھر تم اوم پرکاشؔ کو تو جانتی ہی ہو۔ پیچھے پڑ جائے تو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ اچھا! اب آئندہ خیال رکھوں گا اور جلد آ جایا کروں گا۔''

وہ اس کی آنکھوں کے چھپے چور کو دیکھتی، ہوں ہاں کر کے چپ رہ جاتی اور اس ''آئندہ'' کی آس پھر لگا لیتی جو نوازؔ کے وعدوں کا ٹیپ کا بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے نہ آنا تھا اور وہ نہ آیا! اب نوازؔ کا تاش کا پروگرام ہر ہفتہ ہی ہونے لگا تھا۔ چہرہ کی جھینپ کم ہوتے ہوتے جانے کہاں غائب ہو گئی تھی اور لب ولہجہ سے بے نیازی اور بے رخی ظاہر ہونے لگی تھی۔ تسنیمؔ کی شکایت کا جواب ''اوم پرکاشؔ کی بے جا ضد'' کی بندشوں سے آزاد ہو کر تلخی اختیار کر چکا تھا۔

''دیکھو بھئی! میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں کی ایک ایک منٹ کا حساب تمہیں دوں۔ روز روز کی جھک جھک سے میں عاجز ہو چلا ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو!''

اور نوازؔ پھر پچھلی رات گھر نہیں آیا تھا! تسنیمؔ نے لمبی سی سانس لی اور اٹھ کر بھاری بھاری قدموں سے اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ قیمتی فرنیچر، قالین اور تصاویر سے آراستہ یہ کمرہ کبھی اس کو کتنا عزیز تھا۔ کیسی کیسی خوبصورت یادیں اس سے وابستہ تھیں۔ زندگی کے کیسے دلکش لمحات یہاں گذرے تھے اور اب وہی کمرہ اپنی ویرانی اور خاموشی کے ساتھ اس کو کاٹنے دوڑ رہا تھا۔ اس نے کمرہ کا دروازہ اندر سے آہستہ سے بند کر دیا اور بڑھ کر کونہ میں کھڑی تجوری کا تالا کھول دیا۔ آج تجوری میں بھرے ہزاروں روپے اور لاکھوں کے زیورات سے تسنیمؔ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے تجوری کے اندر والی دراز کھولی، کانپتے ہاتھوں سے اس نے دراز سے نوازؔ کا تیسرا ہاتھ نکالا اور اپنی پرس میں رکھ لیا۔ چند لمحے وہ سر جھکائے کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر تجوری میں تالا لگا کر دروازہ کی جانب پلٹ پڑی۔

اب اس کے چہرہ پر ایک عجیب سا سکون تھا۔ آنکھوں میں اداسی کے بجائے ایک چمک تھی اور قدموں میں اعتماد جیسے نوازؔ کا تیسرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اس کے ذہن و دماغ نے اپنا چولا بدل لیا ہو۔ اس وہ دن اک دم یاد آ گیا جب نوازؔ نے خاصی بھاگ دوڑ اور کاغذی کارروائی کے بعد اسے حاصل کیا تھا اور خوشی سے تسنیمؔ کو دکھایا تھا:

''دیکھو نمّی! یہ کیا ہے!'' نوازؔ کی آواز سے فخر و مسرت ٹپک رہے تھے۔ وہ پیار سے اس کو نمّی ہی کہتا تھا۔ اور وہ اس کے ہاتھ میں اسے دیکھ کر ڈر سی گئی تھی۔

''ہائے اللہ! یہ تم کیا لے آئے؟ کیا کرو گے اس کا تم؟'' اس نے خوف زدہ آواز میں نوازؔ سے پوچھا تھا۔

جواب میں نوازؔ ہنس پڑا تھا اور اس کی ٹھوڑی پیار بھری انگلیوں سے اٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا: ''ارے پاگل کہیں کی! اس سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟ یہ میرا تیسرا ہاتھ ہے تیسرا ہاتھ! میرے پہلو میں رہے گا اور تمہیں اور مجھے دونوں کو سہارا دے گا۔ دیکھو تو زمانہ کتنا خراب ہو گیا ہے۔ دو ہاتھوں سے تین ہمیشہ بھلے ہوتے ہیں۔'' پھر اس

نے لپک کر تسنیمؔ کو گود میں بھر لیا تھا اور گدگدی سے بے حال کر دیا تھا۔ پھر وہ صرف دو ہاتھ ہی یاد رکھ سکی تھی، نوازؔ کے دو ہاتھ!

اور آج نوازؔ کا تیسرا ہاتھ اس کے پرس میں بند اس کے سینہ سے لگا ہوا تھا۔

دروازہ کھول کر اس نے بلند آواز میں خادمہ کو آواز دی: ''فاطمہؔ، اری او فاطمہؔ!''

''جی بیگم ساب!'' فاطمہؔ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی دوسرے کمرہ سے نکل آئی۔

تسنیمؔ نے کمرہ میں واپس مڑتے ہوئے کہا: ''نور محمدؔ سے کہہ دو کہ گاڑی لے آئے۔''

فاطمہؔ ''جی اچھا!'' کہہ کر دوسری جانب تیز تیز قدموں سے چلی گئی۔ تسنیمؔ نے کمرہ اِدھر اُدھر نظر پھرا کر دیکھا۔ آئینہ میں ایک اچھلتی ہوئی سی نگاہ ڈال کر بالوں میں کنگھی پھیری اور ساری کی سلوٹیں یونہی ہاتھ سے سیدھی کرتی ہوئی بیرونی برآمدہ میں آئی تو کار تیار کھڑی تھی اور ایک جانب ادب سے نور محمدؔ ڈرائیور اس کا منتظر کھڑا تھا۔

تسنیمؔ نے اس کو ہاتھ کے اشارہ سے الگ ہٹنے کا اشارہ کیا: ''تم رہنے دو نور محمدؔ، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

نور محمدؔ نے کار کا دروازہ بڑھ کر کھول دیا اور تسنیمؔ نے بیٹھ کر کار میں چابی لگائی۔ چند لمحوں میں کار کوٹھی کے دروازہ سے نکل کر نئی دہلی کی سڑکیں ناپ رہی تھی۔

نوازؔ خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا تو اس کا ارادہ چند سال تفریح کرنے کا تھا۔ دہلی کے امیر تاجر گھرانے کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے ماں باپ بھی اس سے تعلیمی میدان میں زیادہ امیدیں نہیں رکھتے تھے۔ گھر میں پڑھنے لکھنے کا کوئی چرچا بھی نہیں تھا۔ اس کے والد کو اپنی تجارت سے فرصت نہیں تھی اور یوں بھی ان کا خیال تھا کہ زیادہ لکھ پڑھ کر آدمی بزنس کے کام کا نہیں رہ جاتا ہے! والدہ اکلوتے بیٹے کو دہلی سے باہر بھیجنے کے بالکل خلاف تھیں۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی اور اللہ کے فضل و کرم سے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ ہر قسم کی آسائش کے باوجود نوازؔ علی گڑھ جانے کے لئے کیوں بضد تھا۔ ادھر نوازؔ نے علی گڑھ کے قصے سن سن کر وہاں جا کر مزے اڑانے کی ٹھان لی تھی۔ آخر کار اس کی ضد ماں کے انکار پر غالب آ ہی گئی اور وہ ایک سہ پہر علی گڑھ پہنچ گیا۔ باپ کے تعلقات ادھر اُدھر بہت تھے اور خود اس کی جیب کیا کم بھاری تھی! چنانچہ نوازؔ بہت ہی جلد علی گڑھ کے مجلسی حلقوں میں مقبول ہو گیا۔ علی گڑھ کا ماحول ہر طبیعت کے شخص کے لئے سامان مشغولیت مہیا کر سکتا ہے۔ آپ پڑھنا چاہیں تو یونیورسٹی اپنی تمام سہولتوں کی مدد سے آپ کو صحیح راستہ پر لگا سکتی ہے۔ اور اگر آپ کہ صرف تفریح ہی کرنی ہے تو ایسے احباب کی بھی کمی نہیں ہے جو اس میں آپ کا ہاتھ بٹانے اور آپ کی جیب خالی کرانے میں ملکہ رکھتے ہیں! نوازؔ کو جلد ہی میرسؔ روڈ کی چہل قدمی، دوستوں کے ساتھ ہوٹل بازی اور ایسی ہی دوسری مصروفیات نے علی گڑھ کا دلدادہ بنا دیا!

اس سال علی گڑھ کی سالانہ نمائش کیا آئی نوازؔ اور اس کے دوستوں کی بن آئی۔ ہر شام سب کا گروہ نمائش کی راہ لیتا۔ کباب پراٹھوں کا دور چلتا، بازار در بازار ٹہل ہوتی اور منھ کا مزا بدلنے کی خاطر نمائش میں آئی ہوئی لڑکیوں کے پیچھے آوارہ گردی ہوتی۔ اور پھر ایک شام نوازؔ کو ٹہلتے ٹہلتے لڑکیوں کے ایک جھرمٹ میں تسنیمؔ نظر آ گئی اور وہ ٹھٹھک کر لمحہ بھر کو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سادے کپڑوں میں ملبوس، سانولی سلونی، سہج سہج چلتی ہوئی تسنیمؔ اچانک اس کے ہوش و ہواس پر چھا گئی تھی۔ اس نے دہلی میں ایک اسے ایک حسین لڑکی دیکھی تھی اور علی گڑھ میں بھی گھاٹ گھاٹ کا حسن موجود تھا، مگر تسنیمؔ کی شرمیلی صورت اور نظر جھکا کر بانکپن سے چلنے کا انداز معلوم نہیں اس کو کیوں اتنا اچھا لگا تھا۔ دوستوں سے اس کی بے خودی کہاں چھپ سکتی تھی۔ لمحہ بھر میں ہی وہ ان کے چبھتے ہوئے فقروں اور بچکانہ مذاق کا نشانہ بن چکا تھا:

''اماں! کیا اُدھر دیکھے جا رہے ہو؟ کبھی کوئی لڑکی دیکھی نہیں کیا؟ ارے میاں! کچھ تو بزرگوں کی عزت کا خیال کرو!''

''لو یار! یہ تو گیا کام سے! مجنوں کو بھی عشق میں کچھ وقت لگا ہوگا۔ یہ تو اس سے بھی بازی لے گیا!''

''ویسے پسند کی داد تو دینی ہوگی یار! صاحبزادی کیا ہیں بس ایلزبتھ ٹیلر ہیں ایلزبتھ ٹیلر!''

''اور بھائی اس غریب کا کیا ہوگا جو امّی جان نے دہلی میں ڈھونڈ رکھی ہے اور بچپن سے آس لگائے بیٹھی ہے؟''

نوازؔ جو ایسی باتوں پر ہنس دیا کرتا تھا اور مذاق میں شامل ہو جایا کرتا تھا، آج برا مان رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کو اس اجنبی لڑکی پر کسے گئے ان فقروں پر غصہ آ رہا تھا جیسے وہ اس کی کوئی لگتی ہو! وہ جس قدر کھسیاتا اسی قدر دوستوں کے جملوں میں تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ خفا ہو کر وہاں سے واپس چلا آیا تھا اور دوست ہنستے ہوئے دوسری طرف چل دئے تھے کہ یہ غصہ جلدی ہی دھواں ہو جائے گا۔

ادھر تسنیمؔ بھی اپنی سہیلیوں کے غول میں نوازؔ کی نظروں کی گرمی محسوس کر چکی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں نوازؔ کی نظروں سے لمحہ بھر کو ٹکرا گئی تھیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ان بدتمیز لڑکوں پر اس کو بلاوجہ ہی غصہ آ رہا تھا جو مستقل اس کے پیچھے چلے آ رہے تھے اور نمائش کی بھیڑ سے فائدہ اٹھا کر قریب آ آ کر فقرہ بازی پر تلے ہوئے تھے۔

معلوم نہیں کیوں اسے اِس اجنبی لڑکے سے ہمدردی سی محسوس ہو رہی تھی جو لڑکوں کی بیہودگی کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ ان کی تیز نظروں اور اسی قدر تیز فقروں سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اس تماشہ کی وجہ اس کی ہی ذات ہے۔

دوسرے دن نوازؔ نے سر کے درد کا بہانہ کیا اور دوستوں کے ساتھ نمائش نہیں گیا۔ ادھر وہ کھسکے اور اُدھر وہ شیروانی پہن اکیلا وہاں پہنچ گیا اور پھر تسنیمؔ کو اس کی دوستوں کے جھرمٹ میں ڈھونڈ نکالنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ آج وہ ان کے پیچھے ہی گھومتا رہا۔ نظریں مستقل تسنیمؔ پر جمی ہوئی تھیں اور بھیڑ میں وہ لوگوں کے دھکے کھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تسنیمؔ اس سے غافل نہیں تھی۔ نگاہوں سے نگاہیں بھی ملیں اور پھر جھک گئیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا باتیں ہوئیں یہ تو شاید دونوں کو ہی معلوم نہیں تھا مگر دلوں کی بے چینی برابر نظر بچا کر ایک دوسرے کو دیکھنے پر دونوں کو مجبور کر رہی تھی۔

نمائش ختم ہوئی تو نگاہوں کی ملاقاتیں بھی بند ہو گئیں۔ مگر گرلز کالج می کسی طالبہء علم کا پتہ چلا لینا کون سا ایسا مشکل کام تھا۔ نوازؔ پیسوں سے بہت کچھ پہلے بھی خرید چکا تھا۔ کالج کی خادمہ سکوں کی جھنکار پر جلد ہی ریجھ گئی۔ خط و کتابت کا سلسلہ آہستہ آہستہ چھپ چھپ کر ڈری ڈری ملاقاتوں میں تبدیل ہو گیا۔ نوازؔ اور تسنیمؔ ایک دوسرے کے دیوانے ہو چکے تھے۔ پھر نوازؔ نے کسی طرح اپنی ماں کو راضی کر لیا۔ ماں نے باپ سے ذکر کیا۔ تقدیر نے یاوری کی اور ایک دن تسنیمؔ دلہن بن کر نوازؔ کے شب و روز روشن کرنے دہلی آ گئی!

''نمی! تم مجھ کو اتنی اچھی کیوں لگتی ہو؟'' نوازؔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے پوچھتا۔

''نمی! تم مجھ کو کتنا چاہتی ہو؟ سچ کہو میری قسم چاہتی ہو نا؟''

''کیا سوچ رہی ہو نمی؟ کوئی یاد آ رہا ہے کیا؟ یوں خاموش نہ بیٹھا کرو۔ آؤ کچھ بات کریں!''

نمی! نمی! نمی! بعض اوقات تسنیمؔ گھبرا جاتی۔ ''اللہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کسی وقت تو کچھ اور بات کیا کرو!''

مگر پھر وہ نوازؔ کی اتھاہ محبت میں ڈوب جاتی۔ یوں بھی اس کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور پھر نوازؔ کا پیار! اکثر سوچتی کہ ''بھلا مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے؟'' دہلی اور وہاں کی دلچسپ مصروفیات نے اسے ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ کبھی چاندنی چوک کی سیر تھی تو کبھی کناٹ پلیس کی خریداری۔ کبھی محفل موسیقی تھی تو کبھی دوستوں کے ساتھ پارٹی۔ ایسی ہی ایک پارٹی میں نوازؔ کی ملاقات اوم پرکاشؔ کی سالی پاروتیؔ سے ہو گئی تھی۔ دراز قد، بھورے کمر سے نیچے بال، بڑی بڑی شوخ آنکھیں، رنگ ایسا جیسے ابھی ابھی دودھ سے نہا کر آئی ہو۔ سانچہ میں ڈھلا ہوا بدن! پاروتیؔ کو بنانے والے نے کسی فرصت کے لمحہ میں اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ہنستی تو گھنٹیاں سی بج جاتیں اور چلتی تو جیسے مستی اس پر ختم تھی۔ نوازؔ نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اوم پرکاشؔ کی تجربہ کار آنکھوں نے بھی یہ منظر دیکھا اور وہ مسکرا کر انجان بن گیا۔ پھر وہ گلفام سے بھرا گلاس لے کر وہاں سے کھسک گیا کہ آخر دوستی کا بھی اپنا حق ہوتا ہے!

تاش کے کھیلوں کا سلسلہ اس پارٹی کے کچھ دنوں بعد ہی شروع ہو گیا تھا اور پھر یہ بازیاں اتنی رات گئے تک چلنے لگی تھیں کہ نوازؔ گھر دوسرے دن ہی پہنچ پاتا تھا۔ اور تسنیمؔ ناشتہ کی میز پر چھری کانٹے سے کھیل کر جب اکتا جاتی تو ہاتھوں کے کٹورہ میں چہرہ رکھے خالی خالی آنکھوں سے پرلی دیوار کو گھور کر رہ جاتی تھی۔

فون کی گھنٹی بجی تو نوازؔ نے بڑھ کر رسیور اُٹھا لیا۔

''ہیلو! میں نوازؔ بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور دوسرے ہی لمحہ اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ گھبرا کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور کمرہ میں کسی اور کو نہ دیکھ کر ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی آواز اب سرگوشیوں میں بدل چکی تھی۔

''تم؟ کیوں فون کیا تم نے یہاں؟ خدا کے لئے۔۔۔! اچھا اچھا میں پہنچ جاؤں گا۔۔۔ میں سمجھ گیا۔ ہاں ہاں، مجھ کو پتہ معلوم ہے۔۔ اب جاؤ، کوئی سن لے گا تو مصیبت آ جائے گی۔'' اس نے آہستہ سے رسیور واپس رکھ دیا۔ پاس کے کمرہ میں تسنیمؔ نے دوسرا فون واپس رکھا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور دل اڑا جا رہا تھا۔ لمبی سی سانس لے کر وہ برآمدہ میں آئی تو نوازؔ اپنے کمرہ سے نکل رہا تھا۔

''کس کا فون تھا، نوازؔ؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

نوازؔ نے جواب دیا ''ارے، وہی کم بخت اوم پرکاشؔ تھا۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بھئی ایسا پیچھے پڑ جاتا ہے کہ کیا بتاؤں۔''

تسنیمؔ نے سر ہلا کر خالی خالی نظروں سے آنگن کی پرلی دیوار کو دیکھا اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

پلازہ ہوٹل کے مینیجر نے بڑھ کر اس سفید پوش خاتون سے ادب سے پوچھا: ''Yes, madam? May I help you?''

''جی دیکھئے، آپ کے یہاں نواز خاںؔ نام کے ایک صاحب ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ان کا کمرہ نمبر کیا ہے؟'' خاتون نے بڑے دھیمے لہجہ میں کہا۔

مینیجر نے کاؤنٹر کے نیچے سے رجسٹر نکالا اور کچھ دیکھ کر بولا: ''معاف کیجئے گا۔ اس نام کے کوئی صاحب ہوٹل میں نہیں ہیں۔ شاید کہیں اور ہوں گے۔''

خاتون نے پرس کھولا اور ہاتھ ڈال کر چند نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دئے: ''ذرا پھر رجسٹر دیکھ لیجئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہیں مقیم ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

مینیجر نے ایک ہاتھ سے نیلے پیلے نوٹ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے ذرا جھک کر دبی زبان سے کہا: ''کمرہ نمبر 65۔ معاف کیجئے، مجھے یہ اطلاع کسی کو بھی دینے کی اجازت نہیں ہے۔''

خاتون نے سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور تیز قدموں سے ہوٹل کی راہداری میں داخل ہوگئی۔ کمرہ نمبر 65 بند تھا اور دروازہ کے ہینڈل پر Do Not Disturb! کا نشان آویزاں تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے کسی کے چلنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔

''تسنیمؔ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' نوازؔ کی گھبراہٹ سے چیخ نکل گئی۔ وہ ڈریسنگ گاؤن پہنے آنکھیں پھاڑے حیرت زدہ کھڑا تھا اور ظاہر تھا کہ گاؤن کے نیچے اس کا بدن لباس سے بے نیاز تھا۔

''کون ہے نوازؔ؟ کس سے بات کر رہے ہو؟'' کمرہ سے خواب آلود آواز آئی جیسے گھنٹیاں سی بج رہی ہوں۔

تسنیمؔ نے زور سے دھکا دے کر نوازؔ کو پرے کیا اور کمرہ میں داخل ہوگئی۔ پاروتیؔ نے اسے بستر سے سر اٹھا کر دیکھا اور چیخ کر چادر کھینچ کر اپنے بدن پر لپیٹ لی۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور وہ رہ رہ کر نوازؔ کو دیکھ رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے بے بسی سے تسنیمؔ کی طرف گھوم کر دیکھا تو وہ پرس سے نوازؔ کا تیسرا ہاتھ نکال چکی تھی اور اس کا رخ نوازؔ کے سینہ کی جانب تھا۔ گھبرا کر نوازؔ پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹکرایا۔ خوف سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی اور اس کی نظریں تسنیمؔ کے دائیں ہاتھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔

''دیکھو، دیکھو تسنیمؔ! کیا کر رہی ہو تم؟ میری بات تو سنو!'' وہ گھبرا کر گھگھیایا۔

''کیسی رہی تاش کی بازی نوازؔ؟'' تسنیمؔ نے نوازؔ کے تیسرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔

اور پھر تیسرے ہاتھ سے دھائیں دھائیں دو شعلوں نے نکل کر نوازؔ کے سینہ پر سرخ نقش و نگار بنا دئے۔ پاروتیؔ نے چیخ کر چادر چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُدھر نوازؔ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تسنیمؔ کو دیکھتے ہوئے دھڑام سے گر گیا۔ اس کے خون آلود جسم نے دو چار ہچکیاں سی لیں اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

تسنیمؔ نے خالی خالی آنکھوں سے نوازؔ کو دیکھا اور پھر تیسرے ہاتھ کا رخ پاروتیؔ کے کانپتے ہوئے برہنہ جسم کی طرف کر دیا۔ اچانک اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے گالوں پر رینگ گئے۔ ہاتھ نہ جانے کیوں بھاری ہو کر نیچے گر گیا اور اس نے مڑ کر زور سے اچھال کر پستول نواز کے بے جان جسم پر پھینک دیا اور خود بھاری بھاری قدموں سے ہوٹل کی راہداری میں نکل گئی جہاں دنیاوی انصاف کے دعوے دار درجنوں ہاتھ اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

تنکا اور شہتیر

منشی خوشی محمؔد بازار سے سودا سلف لے کر گھر کی جانب چلے تو ان کا ایمان بھرا دل اس جھوٹی اور فریبی دنیا سے تقریباً'' اچاٹ ہو چکا تھا۔ ان کا بس چلتا تو سارے بازار کو پھونک ڈالتے اور سب بے ایمان دوکانداروں کو ان کی چوری اور چار سو بیسی کی پاداش میں جہنم رسید کر دیتے۔ کم بخت آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا اور کسی کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آتی تھی۔ ایمانداری اور سچائی تو جیسے اس نامراد دنیا سے ناپید ہی ہو گئی تھیں۔ غضب خدا کا! ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا اور لوگ تھے کہ بس پیسے کے پیچھے پاگلوں کی طرح بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے۔ انہیں اس بات کا نہ تو علم ہی تھا اور نہ ہی فکر کہ اس دوڑ بھاگ اور دھکم پیل میں کتنے غریب پسے جا رہے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ بازار میں کون سی ایسی چیز تھی جس میں ملاوٹ نہیں تھی؟ ہر دوکاندار ڈنڈی مارتا تھا، ہر بیوپاری دو نمبر کے مال کا کاروبار ڈنکے کی چوٹ پر دن دہاڑے کر رہا تھا اور اپنی اس دیدہ دلیری پر فخر بھی کرتا تھا۔ ہر شخص کے پاس اس عام بدعنوانی اور بے ایمانی کی شکایت کا ایک بندھا ٹکا جواب تھا:

''باؤ جی! کیا بات کرتے ہو؟ سارا بجار سالا یہی کر رہا ہے۔ کون مائی کا لال ایمانداری سے کھالس مال بیچ رہا ہے؟ ارے ساب، ہم نہیں بیچیں گے تو یہ سامنے کی دوکان والا بیچ دے گا۔ پھر ہم ہی کیوں اپنا نکسان کریں؟''

منشی جؔی کو اپنی قوم اور ملک کا ایسا خراب حال دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتے تھے اور اس عام بدحالی کو قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک گنا کرتے تھے۔ وہ روزانہ نماز کے بعد بہت خشوع وخضوع سے دعا مانگتے تھے کہ اللہ تعالی سب کو نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے۔ انہیں چوراہے کی مسجد میں مولوی سمیع اللہؔ کے دئے ہوئے وعظوں کا وہ دور صحابہ کرام بہت یاد آتا تھا جب بقول مولوی صاحبؔ ہر شخص سچا، وعدہ کا پکا اور سوفی صد ایماندار تھا۔ ہر طرف ایمان اور تقوی کی روشنی چھائی ہوئی تھی، ملک پر قانون الٰہی کا راج تھا اور لوگ گھر بیٹھے جنت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ مگر افسوس کہ اب زمانہ کتنا خراب ہو گیا تھا۔ شاید قرب قیامت کا خوف ہی تھا جو انہیں کچہری میں اپنے چبوترے پر بیٹھ کر موکلوں سے فارغ وقت میں یاد اللہ کروایا کرتا تھا، اور وہ کرتے کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر تسبیح پر وظیفہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ انہیں یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ مذہب اور عبادت سے اپنے شوق کی نمائش کورٹ کچہری کی گندی فضا میں کریں۔

ہاتھ میں سودے کا تھیلا اور زبان پر اللہ ہو کا وظیفہ لئے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئے تو صحن میں ان کی بیوی کریمؔن نائن سے جھک جھک کر رہی تھیں جو محلّہ پڑوس کی بیبیوں سے اگلے اتوار کو ہونے والے کے دعوت نامہ پر ''صاد'' بنوا کر چند منٹ پہلے ہی لوٹی تھی۔

''اے ہے، کریمؔن بوا! کبھی تو قدم بڑھا کر کام کر دیا کرو۔ صبح کی نکلی اب آئی ہو۔ سارا دن نگوڑا نکل گیا۔ اور بھی تو کام کرنے ہیں۔ میلاد شریف ہے، کوئی اٹھاؤ چولہا تھوڑی ہے!''

کریمؔن بوا نے پان کا بیڑا اکلے میں دبا کر میلے دوپٹے سے ہاتھ پوچھے اور جواب دیا: ''اے بی بی! یہ اللہ مارے بوڑھے پیر اب نہیں چلتے ہیں۔ پھر کوئی گھر مارکیٹ میں ہے تو کوئی روٹی والی گلی میں۔ چلتے چلتے آدمی بَولا جاوے ہے! تم مجھے رکشہ کر دیا کرو۔ کام جلدی ہو جاوے گا۔''

فردوسی بیگؔم زیر لب مسکرا کر بولیں: ''ہاں رکشہ نہیں، میں تمہارے لئے موٹر کر دوں گی۔ توبہ ہے بوا! اچھا جاؤ۔ اتوار کی صبح ہی آ جانا۔ کام ہی کام ہے۔''

کریمؔن بوا زیر لب کچھ بڑبڑاتی باہر ڈیوڑھی کی طرف چل دیں اور فردوسؔی بیگم منشی جی کی طرف مڑ گئیں۔ وہ اب برآمدہ میں مونڈھے پر بیٹھ کر جیب سے تسبیح نکال رہے تھے۔ انہیں دعوت نامہ بھیجنے کا یہ طریقہ نہایت فرسودہ اور ناقص معلوم ہوتا تھا کہ کریمؔن نائن گھر گھر رقعہ کے کر گھومے اور نیک بیبیاں اپنے اپنے نام کے آگے: صاد: کی چڑیا بٹھا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ ان کے نزدیک یہ طریقہ اس زمانہ کی یادگار تھا جب لوگ ٹیلی فون اور ٹی وی سے بالکل ناواقف تھے۔ آج بھی وہ شاید عادتاً'' وہی پرانی بحث لے بیٹھے جو اس سے پہلے خدا جانے کتنی مرتبہ ہو چکی تھی۔

وہ تسبیح واپس جیب میں رکھتے ہوئے بولے: ''ارے بھئی! پھر وہی رقعہ بازی شروع کر دی؟ ذرا سوچو تو سہی کہ اگر کریمنؔ چلتے چلتے تھک جائے اور دو ایک ناموں کے آگے خود ہی: صاد: کا طوطا بنا کر واپس آ جائے تو تم کیا کر لوگی اس کا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گھر کا کوئی بچہ ہی کاغذ پر چڑیا بٹھا دے اور اماں جان کو پتہ بھی نہ چلے!''

منشی خوشی محمدؔ نے اپنی منطق لگا کر بیگم کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا جو تھیلے سے سودا نکال رہی تھیں۔ فردوسی بیگمؔ بھی اس سوال کی ایسی عادی ہو چکی تھیں کہ ان کا جواب منجھ منجھ کر اب سکہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ مسکرا کر بولیں:

''تم تو میلا دشریف کو بھی کورٹ کچہری سمجھتے ہو! آج تک کبھی ایسا ہوا ہے جواب یہ نئی بات ہوگی؟ موئی کریمنؔ کو کالا اکچھر بھینس برابر ہے۔ وہ کیا جانے کون سا نام کس کا ہے اور : صاد: کس چڑیا کا نام ہے۔ کسی اور سے: صاد: کرائے گی تو اپنے کام سے جائے گی۔ پھر کون کرائے گا اس سے کام؟''

منشی جیؔ اس جوابی منطق سے ہمیشہ لاجواب ہو جاتے تھے۔ فردوسی بیگمؔ ٹھیک ہی تو کہتی تھیں۔ کریمن بواؔ کام میں گھپلا کرتیں تو اگلی مرتبہ کون ان کو کام دیتا؟ دراصل منشی خوشی محمدؔ کچہری میں کام کرتے کرتے اور جھوٹے سچے کاغذ بھرتے بھرتے خود بھی شکی ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر بات میں انہیں جھوٹ اور فریب نظر آتا تھا اور وہ آسانی سے کسی کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں لگاتار دو سال فیل ہونے کے بعد ابا جیؔ نے ان کو اپنے ایک خرانٹ منشی دوست کے پاس کام سیکھنے کے لئے کچہری میں بٹھا دیا تھا۔ اس ناہنجار مدرسہ سے وہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے جو ہر کچہری کا ہوا کرتا ہے۔ اب ان کی سمجھ ایک ہی پٹری پر اچھی طرح چل سکتی تھی۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ مولوی سمیع اللہؔ کی صحبت اور بعد میں بیعت نے پوری کر دی تھی۔ وہ مولوی صاحبؔ کے وعظ سن سن کر اپنے خیالات اور معتقدات میں اور بھی کٹر ہو گئے تھے۔ اب ان کے ٹھس دماغ کا خیال تھا کہ ان کی نمازیں اور وظیفے ان کی کچہری میں روزانہ کی ہیرا پھیری کی تلافی کر دیں گے اور یہ کہ اسلام صرف سنیوں تک ہی محدود ہے اور وہ بھی حنفیوں تک جن کو وہ فخر سے ''ٹناٹن سنی'' کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ باقی مسلمانوں کو وہ کافر یا وہابی کہا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی نفرت اور تعصب کی وجہ خود بھی نہیں بتا سکتے تھے، شاید اس لئے کہ ہر متعصب شخص کی طرح وہ خود اپنے مسلک کی معلومات میں بھی نرے کورے ہی تھے۔

مولوی سمیع اللہؔ کے بعد منشی جیؔ اگر کسی سے دبتے تھے تو وہ ان کی بیوی فردوسی بیگمؔ تھیں۔ ایک وجہ تو شاید ہماری سماجی روایت ہے کہ ہر شریف آدمی تھوڑا بہت اپنی بیوی سے خوف زدہ ضرور رہتا ہے! دوسری وجہ منشی جیؔ کے لیے یہ تھی کہ ان کی بیوی نے میٹرک کا امتحان پہلی ہی مرتبہ تھرڈ ڈویزن میں پاس کر لیا تھا جبکہ منشی جیؔ دو بار فیل ہو چکے تھے۔ فردوسی بیگمؔ کی بات سن کر وہ کچھ چپ سے ہو گئے اور غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ پھر جیب میں پڑی تسبیح کی جانب بڑھا کہ اللہ کی یاد دنیاوی جھگڑوں اور بحثوں کے لئے بہترین علاج ہے۔ بیگم بھی شاید یہ بے تکی بحث ختم کرنی چاہتی تھیں۔ تخت سے اٹھتی ہوئی بولیں:

''موا وہ رحمت علیؔ پھر پتلا دودھ دینے لگا ہے۔ بالکل گھور سا لگا ہے۔ ذرا اس سے بات تو کرنا۔''

منشی جیؔ نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا: ''کر لوں گا مگر اس سے ہوگا کیا؟ زمانہ ہی کم بخت چوری اور بے ایمانی کا آ گیا ہے۔ شریف آدمی بھلا کیا کرے۔ پچھلی مرتبہ شکایت کی تھی تو رحمت علیؔ نے کہہ دیا تھا کہ بھینس پانی زیادہ پی گئی ہوگی جو دودھ پتلا ہو گیا۔ لاحول ولاقوۃ! اس سے پہلے کہتا تھا کہ بھینس کو نظر لگ گئی تھی!''

منشی جیؔ شاید ابھی کچھ اور کہتے لیکن فردوسی بیگمؔ نے انہیں اس کا موقعہ ہی نہیں دیا اور ایک فیصلہ کن انداز میں وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانہ کی طرف چل دیں:

''ہوں نظر لگ گئی! توبہ توبہ! کم بخت بھینس نہ ہوئی حور پری ہو گئی۔ ایں نہیں تو۔۔''

اور منشی جیؔ جیب سے تسبیح نکال کر اللہ ہو! کی ضرب لگانے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ابھی وظیفہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ چھوٹے بیٹے نے اطلاع دی کہ مستری رام نارائنؔ کام کرنے کے لئے گیا ہے اور منشی جیؔ اٹھ کر باہر چلے گئے۔

رام نارائنؔ آج بڑی مشکل سے ہاتھ آیا تھا بلکہ اگر لالہ کشن پرساؔد سفارش نہ کرتے تو شاید وہ آج بھی ٹال جاتا۔ کام بھی تو اس کے پاس اتنا زیادہ تھا۔ اس کی چار سو روپے فیس سن کر منشی خوشی محمدؔ پہلے پہل ذرا کسمسائے تھے۔ مگر پھر جب ان کی آنکھوں کے سامنے ماہانہ بجلی کے بل آ آ کر لہرانے لگے تھے تو وہ بادل ناخواستہ راضی ہو گئے تھے۔

اور اب منشی جیؔ گھر کے بیرونی برآمدہ میں اپنے عمر رسیدہ مونڈھے پر بیٹھے مستری رام نارائنؔ کی کاریگری دیکھ رہے تھے۔ ان کی سرمہ سے سیاہ ادھ کھلی آنکھیں رام نارائنؔ کے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں اور خود ان کی انگلیاں پچھلے سال حج پر مکہ معظّمہ میں خریدی ہوئی تسبیح کے سیاہ دانوں پر تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ الا اللہ کی ہر ضرب پر ان کی شہادت کی انگلی بے اختیار لہرا کر کھڑی ہو جاتی تھی گویا اللہ کی وحدانیت کی تصدیق کر رہی ہو۔ ساتھ ہی ان کی چھاج ایسی داڑھی میں ایک پھریری سی آ جاتی تھی۔ اس ایمان افروز منظر سے بے نیاز مستری رام نارائنؔ اپنے کام میں مصروف تھا۔ بجلی کا میٹر اپنی بندشوں سے آزاد دیوار پر تاروں سے لٹک رہا تھا اور رام نارائنؔ زنبور سے مختلف تاروں

کے کان مروڑ کر انہیں ایک دوسرے سے جوڑ رہا تھا۔ ایک تو بجلی کا کام یوں بھی خطرناک ہوتا ہے اور پوری توجہ چاہتا ہے، پھر اسے یہ بھی فکر تھی کہ کام پورا کر کے پیسے وصولے اور چوک میں ہنومان مندرؔ میں دو نمبر کی پاور لائن لگانے چلا جائے۔

سچ پوچھئے تو معاملہ تھا بھی گمبھیر۔ کم بخت بجلی کا کوئی ٹھکانہ تو تھا نہیں۔ صبح ہے تو شام نہیں ہے اور شام ہے تو صبح کا بھروسہ نہیں۔ جاڑے، گرمی، برسات کسی موسم کی قید نہیں۔ اور اگر آئی بھی تو وولٹیج کا ٹھکانہ نہیں۔ کبھی اتنی تیز کہ بلب بھک سے اڑ جائیں اور کبھی ایسی کم کہ سو واٹ کے بلب پر موم بتی کا گمان ہو۔ وہ تو یہ کہئے کہ ٹی وی اور ریفریجریٹر ہزار ہزار روپے کے ریگولیٹر (Regulator) سے لیس تھے ورنہ معلوم نہیں کب کے اللہ کو پیارے ہو چکے ہوتے۔ عاجز آ کر لالہ کشن پرسادؔ کے کہنے پر منشی جیؔ نے بجلی کے کھمبے سے بالا ہی بالا دو نمبر کی لائن ڈلوالی تھی جس کا محنتانہ رام نارائنؔ مستری نے پانچ سو روپے سکہء رائج الوقت اس گارنٹی کے ساتھ لیا تھا کہ: ''منسی جی! سارے محلّہ کی بجلی گائب ہو جائے، پر سالی تمہاری نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر گائب ہو جائے تو اپنی جوانی کسم منسی جیؔ! جوتے لگانا جوتے!''

خیر، مستری رام نارائنؔ کی جوانی کے صدقہ اب بجلی غائب تو نہیں ہوتی تھی، البتہ بل اتنے بڑے بڑے آتے کہ منشی جیؔ کچہری کی: ہذا من فضل ربی: کی قسم کی آمدنی کے باوجود حواس باختہ ہو جاتے۔ دوسرے مہینہ ہی گھبرا کر پھر لالہ کشن پرسادؔ سے رائے لی تھی اور اب مستری رام نارائنؔ میٹر سے بالا ہی بالا بجلی کا انتظام کر رہا تھا۔ اس نے منشی جیؔ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کام ختم ہو جانے کے بعد وہ جب چاہیں گیا ایک مخصوص سوچ دبا کر بجلی کا رخ میٹر کی جانب موڑ سکیں گے تا کہ وہ کچھ دیر چل سکے اور ماہ بماہ بجلی کے محکمہ کو ایک چھوٹی سی رقم بطور بل ادا کی جا سکے۔ پھر وہ اسی سوچ کو آف کر کے ایر کنڈیشنر، ٹی وی وغیرہ سے دل کھول کر فیض یاب ہو سکیں گے جبکہ میٹر خاموش تماشائی کی طرح ساکت و جامد کھڑا ہو جایا کرے گا۔

منشی جیؔ نے اپنی جیب کی فہمائش پر اپنے دل میں رام نارائنؔ کے کام پر کوئی تردد محسوس نہیں کیا تھا۔ آخر محلّہ میں کون ایسا تھا جس نے میٹر کو ''بائی پاس'' نہیں کرا رکھا تھا؟ پھر منشی جیؔ میں ہی کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا تھا جو وہ خواہ مخواہ بجلی کا پورا بل دے کر نقصان اٹھاتے؟ وہ ویسے ہی نیک اور دینی کاموں میں کسی مائی کے لال سے پیچھے کب تھے؟ ابھی پچھلے دنوں ہی چوراہے کی مسجد میں رنگ و روغن کرانے کے لئے پورے پانچ سو روپے دئے تھے۔ یہ اور بات ہی کہ کریم بخش کنجڑے کی بیوہ کی تجہیز و تکفین میں وہ صرف دس روپے ہی دے سکے تھے۔ ایک تو ان دنوں ان کا ہاتھ تنگ تھا۔ دوسرے یہ کہ محلّہ میں اور لوگ بھی تو تھے۔ ہر کام کا ٹھیکہ منشی جیؔ ہی نے تھوڑی لے رکھا تھا!

رام نارائنؔ مستری کام سے فارغ ہو کر اور اپنے پیسے لے کر روانہ ہوا تو عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ منشی جیؔ نے وضو کیا اور مسجد کی جانب تیز تیز قدموں سے چل دئے تا کہ جماعت میں شرکت کی سعادت سے محروم نہ رہ جائیں۔

اتوار کی حسب معمول مختارؔ بیڑی کی بیٹھک میں تاش کی بازی لگی ہوئی تھی۔ اپنی چاند مارکہ بیڑی ہونٹوں میں دبائے مختارؔ کرسی پر پیرا اٹھائے، پھسکڑا مارے بیٹھا ہمیشہ کی طرح جھوم رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد بیڑی کا دھواں خلیل خاںؔ یا سید کاظم حسینؔ کی طرف چھوڑ کر اپنی سکہ بند گالیوں سے ان کے کھیل کے اناڑی پن پر ماہرانہ تبصرہ کرتا جاتا تھا۔ وہ مجھ کو اپنی اس بیہودہ حرکت کا نشانہ کم ہی بناتا تھا۔ شاید اس کی وجہ میری وہ فطری بزدلی تھی جس سے مجبور ہو کر میں اس کی گالیوں اور بیہودہ باتوں کا جواب ایک پھیکی سی مصنوعی مسکراہٹ اور خاموشی سے دیا کرتا تھا جبکہ خلیل خاںؔ اور کاظم حسینؔ دونوں اس کوتر کی بہ تر کی جواب دینے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ بہت جلد ہی مختار بیڑیؔ نے بقول خود میرا ''مانجھا ڈھیلا دیکھ کر'' مجھ کو اپنی سخت و سست باتوں کا مستحق ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

ہم تینوں مختار بیڑیؔ کے ساتھ تاش کی میز پر بیٹھے ضرور تھے مگر شاید صرف اس لئے کہ ایک ہاتھ سے تاش کے پتّے میز پر ڈالیں اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیبیں خالی کر کے اپنی گاڑھے پسینہ کی کمائی اس کی جیب میں منتقل کرتے جائیں۔ وہ کم بخت آج بھی بازی پر بازی جیتے جا رہا تھا۔ سڑک چھاپ فلمی گانوں کے بول اپنی بھونڈی اور بے سری آواز میں گنگنا رہا تھا، اور جھوم جھوم کر بیڑی پر بیڑی پھونکے جا رہا تھا۔ تقریباً ''اسی رفتار سے خلیل خاںؔ اور سید کاظم حسینؔ کی جھلاہٹ بھی بڑھ رہی تھی۔ رہ گیا میں تو شروع سے ہی تاش کی میز پر میں اپنی قسمت کی خرابی پر شاکر ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی بدتقدیری کا حل یوں نکالا تھا کہ بازی پر پیسے کم لگاتا اور مختار بیڑیؔ کی منگوائی ہوئی چائے اور نمک پاروں پر زیادہ توجہ رکھتا تھا۔ وہ اس صورت حال سے بے خبر نہیں تھا لیکن ایک اچھے جواڑی کی طرح آئندہ کی آمدنی کی امید پر یہ لاسہ ہمیشہ تیار رکھتا تھا اور ہم جانتے بوجھتے شکار ہوتے تھے۔

ابھی خلیل خاںؔ اور مختار بیڑیؔ آپس کی گالم گلوج سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ بیٹھک کے دروازہ پر کھنکھارنے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو ہاتھ میں تسبیح لئے اور شانوں پر سرخ چار خانہ دار انگوچھا ڈالے منشی خوشی محمدؔ کھڑے تھے۔ مختار بیڑیؔ نے تاش پٹکتے پٹکتے ہاتھ روک کر ذرا بے دلی سے کہا: ''آیئے منشی جیؔ! آیئے۔'' اچھی خاصی دال میں یہ کالا اس کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

منشی جیؔ سیڑھی چڑھ کر بیٹھک میں داخل ہوئے اور قریب پڑے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔ مختار بیڑیؔ نے ان کی ''سلامالیکم'' کا جواب بیڑی کو ہونٹوں میں بُد بُدا کر دیا اور اپنی چندھی آنکھوں سے انہیں سوالیہ انداز میں دیکھا۔ منشی جیؔ نے تسبیح چوم کر جیب میں ڈالی اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے:

''بھئی وہ ہمارے گھر آج میلاد شریف ہی نا! میں نے سوچا کہ بہت دنوں سے آپ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے، سلام کر آؤں۔'' وہ خود بھی اپنے اس لنگڑے عذر سے خوش نظر نہیں آ رہے تھے۔

مختار بیڑیؔ نے مسکرا کر مجھ کو آنکھ ماری اور منشی جیؔ سے بولا: ''والیکم سلام! والیکم سلام منشی جی! واقعی آپ سے ملاقات کم ہی ہوتی ہے۔ لیجئے چائے پیجئے۔''

منشی جیؔ کی طرف چائے کی پیالی بڑھا کر مختارؔ نے تڑاخ سے پتہ میز پر مارا: ''لو بچو! اس کو کاٹو تو جانیں کہ اپنی ماں کے جنے ہو!'' اس کا خطاب تو خلیل خاںؔ سے تھا لیکن غبار منشی جیؔ کے چہرہ پر آ گیا۔ انہیں ایسی بیہودہ باتیں سخت ناپسند تھیں۔ ابھی وہ سموسہ کا لقمہ زبان سے کلے میں کھسکا کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مختار بیڑیؔ مسکرا کر ان سے بولا:

''یار منشی جیؔ! آج تو ایک بازی کھیل ہی لیں! کون سی سالی قیامت آ جائے گی؟''

منشی جیؔ قیامت کے حق میں ایسی غیر شرعی اور غیر شائستہ بات سن کر ذرا غصہ میں آ گئے اور شاید مختار بیڑیؔ کا مطلب بھی یہی تھا کہ ان سے چھیڑ کی جائے۔

وہ تیوری پر بل چڑھا کر بولے: ''بھئی مختار میاں! کسی وقت تو بات چیت میں احتیاط برتا کریں۔ یہ کیا کہ جو منھ میں آیا کہہ دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں تاش وغیرہ کو اچھا نہیں سمجھتا ہوں۔ وقت خراب ہوتا ہے اور آدمی نیک کاموں سے بھی جاتا ہے۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔''

مختار بیڑیؔ پر ان کی اس تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بڑی بے نیازی سے پتے پھینٹتا ہوا بولا: ''منشی جیؔ! میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی جو آپ کو بری لگ گئی۔ سالا کھیل ہی تو ہے، اور کیا!''

منشی جیؔ نے بڑی کوشش سے یہ گالی برداشت کی اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کے خالص مولوی سمیع اللہؔ کے انداز میں بولے: ''معاف کیجئے گا، یہ بات تو آپ عجیب سی کرتے ہیں کہ تاش میں کوئی برائی نہیں ہے۔ پھر مزے کی بات یہ کہ آپ لوگ تاش کی بازی پر پیسے لگاتے ہیں۔ یہ تو جوا ہوا، جوا! اور میرے بھائی! جوا اسلام میں حرام ہے، بالکل حرام! قرآن کریمؔ میں صاف لکھا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں نا تاش سے فرصت پا کر۔'' منشی جیؔ نے چٹکی لی۔ ''میری مانیں تو آپ لوگ یہ حرام کام چھوڑ دیجئے اور خالی وقت میں کوئی نیک کام کیا کیجیے۔ اللہ ثواب سے نوازے گا اور عاقبت سنورے گی۔''

خلیل خاںؔ نے حکم کا غلام میز پر پھینکتے ہوئے منشی جیؔ کو ذرا کڑوی نظروں سے دیکھا اور ان سے کہا: ''اجی منشی جیؔ! یہ تو تفریح ہے، کوئی باقاعدہ جوا تھوڑی ہے۔ بازی پر دو چار روپے نہ لگائیں تو مزا نہیں آتا ہے۔ کون سا گھر لٹا رہے ہیں ہم لوگ جو ایسا غضب ہو گیا؟''

منشی خوشی محمدؔ نے بڑے تحمل سے مسکرا کر جواب دیا: ''میاں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی! کل آپ یہ کہیں گے کہ ایک چمچہ شراب پینے میں کیا حرج ہے؟ بھائی، جو چیز اللہ نے حرام ٹھیرائی ہے وہ تھوڑی بھی حرام ہے اور بہت بھی۔ میں قرآن کریمؔ سے بحث نہیں کرتا ہوں۔ ایسا کروں گا تو گناہ گار ہوں گا اور عنداللہ ماجور بھی ٹھیروں گا۔''

اب معاملہ تاش اور جوے سے گذر کر شراب تک پہنچ گیا تھا اور منشی جیؔ ہم سب گناہ گار بندوں کو دبے الفاظ میں جہنم کی آگ دکھا دکھا کر ڈرانے پر تلے ہوئے تھے۔ مختارؔ نے زور سے ''ہوں ں ں'' کی اور اپنی نام نہاد چوہے کی دم ایسی مونچھوں پر شہادت کی انگلی پھیر کر منشی جیؔ سے اتفاق کرتے ہوئے بولا:

''منشی جیؔ! یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ جوا حرام ہے۔ اور ہمیں اس سالی عادت کو فوراً سے پیشتر چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ جو کھٹمل کا ظمّو ابیٹھا ہوا ہے نا، اسی نے ہمیں یہ لت لگوائی ہے۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اس خبیث عادت کو بالکل چھوڑ دوں گا۔'' اس نے منشی جیؔ کی نظر بچا کر کاظم حسینؔ کو آنکھ ماری جو اس کی گالی کے پتھر کا جواب ویسی ہی مرصع اینٹ سے دینے کے لئے منھ کھول ہی رہا تھا۔

منشی جیؔ نے اپنی تبلیغ کا اثر اتنی تیزی سے کسی پر ہوتا ہوا تو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اک دم سے کھل ہی تو پڑے اور مختارؔ کے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بولے: ''بھائی، اللہ ہم سب کو نیک توفیق دے۔ آپ نے تو آج بہت بڑی بات کہہ دی۔ ماشاءاللہ! ماشاءاللہ!''

مختار بیڑیؔ نے بڑی انکساری سے سر جھکا کر اپنی چندھی آنکھوں کے کنارے رومال سے پوچھتے ہوئے کہا: ''بس منشی جیؔ! آپ ہمارے حق میں دعا فرمائیے۔ جوا بھی چوری کی طرح بہت بری چیز ہے۔ ٹھیک ہے نا منشی جیؔ؟''

منشی جیؔ نے بہت محبت سے جواب دیا: ''کیوں نہیں میاں کیوں نہیں! اس میں کیا شک ہے کہ چوری بہت ہی بڑا جرم ہے۔ لوگوں کو برے کاموں سے فرصت ملے تو ادھر دھیان جائے۔ پچھلے جمعہ کو مولوی سمیع اللہؔ صاحب نے خطبہ میں گناہوں اور گناہوں کی سزا پر بڑی روشنی ڈالی۔ سن کر میری تو آنکھوں میں آنسو آ گئے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے

رونگٹے کھڑے ہو گئے۔'' انہوں نے کانپ کر ایک جھرجھری سی لی جیسے مسجد میں کھڑے ہونے والے رونگٹے اب بھی سزا کا خوف دلانے پر آمادہ تھے۔

انہوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میرے بھائی! چوری کی سزا شریعت میں یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔'' انہوں نے بائیں ہاتھ سے دائیں کلائی پر آری چلا کر یہ خوفناک سزا ہم سب کو دکھائی!

مختار بیڑیؔ نے اپنی چندھی آنکھوں کو بڑی کوشش سے پھاڑ کر منشی جیؔ کو دیکھا: ''چور کا ہاتھ کاٹ دینے کی سزا ہے منشی جی؟ ارے باپ رے باپ!''

منشی جیؔ اب جوش میں آ چکے تھے۔ انہیں مختار بیڑیؔ جیسا بدکار جواڑی اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر کے ان کی تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمان ہوتا صاف نظر آ رہا تھا!

''جی ہاں! ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہے جناب! اور یہ تو ہوئی انسانی سزا جو اس دنیا میں ملا کرتی ہے۔ پھر آخرت میں جو سزا اللہ کی جانب سے اس کی نافرمانی پر دی جائے گی وہ اس سے الگ ہے۔ توبہ ہے یا اللہ توبہ!'' منشی جیؔ نے جلدی جلدی اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ لگاتے ہوئے کہا۔

''منشی جی! یہ تو آپ نے آج ہم پر بڑی مہربانی کی ورنہ ہمیں تو کچھ بھی نہیں معلوم تھا! تو منشی جیؔ! چوری کیسی بھی ہو، سزا اتنی ہی سخت ہے؟'' مختارؔ نے بڑے رقت آمیز لہجہ میں پوچھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی آنسو ٹپک پڑیں گے۔

''ارے بھائی! بالکل، اس میں کیا شک ہے! مولوی سمیع اللہؔ اپنے وعظ میں فرما رہے تھے کہ اللہ کا قانون ہر ایک کے لئے ایک ہی ہے۔ زنا کریں گے تو کوڑے لگیں گے۔ چوری کریں گے تو ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اللہ اللہ خیر صلاح!'' منشی خوشی محمدؔ نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے فتوہ صادر کیا۔

مختار بیڑیؔ نے تاش کے پتے میز پر رکھ دئے اور منشی خوشی محمدؔ کی سُرمہ لگی آنکھوں میں اپنی چندھی آنکھیں ڈال کر بولا: ''اور منشی جیؔ! بجلی کی چوری کے بارے میں کیا حکم ہے اللہ کا؟ کیا اس پر بھی ہاتھ کاٹ کر ہم کو دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے گا؟''

بیٹھک میں یک لخت موت کا سا سناٹا چھا گیا! منشی خوشی محمدؔ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مختار بیڑیؔ کو گھورے جا رہے تھے۔ ان کا گندمی رنگ پہلے پیلا ہوا اور پھر اک دم سرخ ہو کر کجلا گیا۔ یکا یک وہ اٹھے اور ایک ہی جست لگا کر سیڑھیاں پھلانگ کر گلی میں غائب ہو گئے۔ بیٹھک میں اب صرف تاش کی گڈی کی آواز آ رہی تھی جس کو مختار بیڑیؔ منھ میں چاند مار کہ بیڑی دبائے اطمینان سے فٹافٹ پیس رہا تھا!

اس اتوار کے بعد منشی خوشی محمدؔ پھر کبھی مختارؔ کی بیٹھک میں نظر آئے۔ مختار بیڑیؔ بقول خود منشی جیؔ سے چند شرعی مسائل پر اور معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اور ان کی اگلی آمد کا منتظر تھا۔ باقی کے تین جواڑیوں کا خیال ہے کہ ایسے نیک اور باسعادت موقع کا امکان اب نہایت کم ہے کیونکہ مختار بیڑیؔ کی چندھی آنکھوں کا تنکا منشی خوشی محمدؔ کی ایمان کی روشنی سے منور آنکھوں کا شہتیر ایک ہی ضرب میں توڑ چکا ہے!

خلیل خاںؔ کے طوطے

یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب بقول مختار بیڑؔی، خلیل خاںؔ علی گڑھؔ کی گلیوں میں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ خود خلیل خاںؔ کے ہاتھوں کے طوطے اچانک پُھر ررر سے یوں اڑ گئے کہ وہ حواس باختہ ہو کر دوسروں کا منھ تکتے کے تکتے رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں اور کہاں جائیں! اپنی اس سراسیمگی میں وہ نہ صرف سید کاظم حسینؔ کی طنزیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے رہے بلکہ مختار بیڑؔی کی سلّہ بند گالیوں سے بھری ہوئی باتیں بھی سُنی ان سُنی کر رہے تھے، حالانکہ اس حادثہ سے پہلے وہ مختار بیڑؔی کو اس ک بیہودہ باتوں پر ترکی بہ ترکی جواب دینے اور پھٹکارنے سے نہیں چوکتے تھے، اور سید کاظم حسینؔ کو ''مردود کھٹمل'' کے شاعرانہ لقب سے نواز کر اپنی تسکین دل کا سامان پیدا کر لیا کرتے تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ کم بخت حالیہ حادثہ تھا بھی ایسا زلزلہ خیز کہ اگر خلیل خاںؔ کے ہاتھوں کے طوطے پُھر ررر سے نہ اڑتے تو حیرت بلکہ عبرت کا مقام ہوتا! دراصل ہوا یوں کہ۔۔۔۔ لیکن ذرا ٹھیرئے! میں اپنی جلد بازی میں آپ کو یہ قصہ بیچ میں سے ہی سنائے جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر سارا واقعہ شروع سے نہیں سناؤں گا تو آپ کو پوری بات سمجھنے میں پریشانی ہوگی اور آپ مجھ سے جا و بے جا سوالات کریں گے۔ کچھ کا میں جواب دوں گا اور کچھ سے کھسیا کر آپ سے بیزار ہو جاؤں گا! اس سے کوئی اچھا نتیجہ ظاہر ہونے کا امکان نہایت کم ہے۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ میں یہ قصہ آپ کو شروع سے ہی سناؤں۔

پھر ایک مسئلہ مختار بیڑؔی کی گالیوں کا بھی ہے۔ اُس کا ذکر آئے گا تو اس کی دی ہوئی گالیاں دہرانی پڑیں گی۔ نہ میرا مزاج اور تربیت اسکی اجازت دیں گے کہ میں ایسی بالغ قسم کی گالیاں دہراؤں اور نہ آپ کی شرافت انہیں سننے کو تیار ہوگی۔ چنانچہ اس مسئلہ کا حل اس طرح نکالا ہے کہ جہاں آپ کو ایسی لمبی لکیر ''۔۔۔۔'' آئے، وہاں آپ ماں، بہن یا اسی قبیل کی کوئی بھاری گالی فرض کر لیجئے گا۔ اس سے یقیناً ''وہ مزا تو نہیں آئے گا جو اصل گالی میں ہوتا ہے اور جس سے میری اور آپ دونوں کی زبان اور عاقبت کے خراب ہونے کا خطرہ ہے، پھر بھی ضابطہ کی کارروائی تو پوری ہو ہی جائے گی۔ تو لیجئے اب یہ قصہ سنئے۔

اس زمانہ میں خلیل خاںؔ کی علی گڑھؔ میں بالائی قلعہؔ سے اتر کر بڑے بازار کے چوراہے پر بزازہ کی دوکان تھی۔ خان صاحبؔ پیشہ کے لحاظ سے کامیاب بزاز تھے مگر شوق انہیں قدرت نے تاش کا دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایسے شوق کے ساتھ انہیں اسی کینڈے کا دماغ اور صلاحیت دینا بھول گئی تھی۔ چنانچہ وہ تاش کے دھتی وہ ضرور تھے لیکن قسمت کے دھنی ہونے کا الزام ان پر کسی صورت میں نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس پر طرفہ تماشہ یہ دیکھئے کہ ان کا پالا مختار بیڑؔی ایسے گھاگ سے پڑا تھا جو آس پاس دو چار علاقوں میں نامی کھیلنے والا مشہور تھا۔ اس سے ہارے ہوئے سبھی کھلاڑیوں کا یہ خیال تھا کہ وہ کھیل میں ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہے یا پھر نظر بندی کا کوئی عمل اس کو آتا ہے مگر چونکہ آج تک ان کھمبا نوچنے والی کھسیانی بلیوں کے پلے مختار بیڑؔی کی کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں آئی تھی اس لئے بات زیادہ آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاند مار کہ بیڑی کے کش پر کش لگاتا رہتا اور ہنس ہنس کر دونوں ہاتھوں سے پیسے بٹورتا رہتا تھا۔

شروع شروع میں تو ہم لوگ اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا نقصان مصنوعی ہنسی ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے مگر جیسے جیسے یہ نقصان بڑھتا گیا ہماری ہنسی بھی اسی رفتار سے کم ہوتی گئی اور اب کھسیانی جھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ تاش کی لت اور مختار بیڑؔی سے اپنے ہارے ہوئے پیسے واپس جیت لینے کی خواہش ایک دوسرے کہ سہارا دے رہی تھیں۔ مختار بیڑؔی پر اس قسم کی بچکانہ باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسی طرح بیڑی کے بدبودار دھوئیں کے مرغولے ہم لوگوں پر چھوڑتا رہتا اور کھیل کے خاتمہ پر نئی بیڑی سلگا کر اپنی چندھی آنکھوں سے خلیل خاںؔ کو گھور کر کہتا:

''کہو بیٹا کیسی رہی؟ اور کھیلو گے تاش؟ سالے کسی استاد سے کھیل کیوں نہیں سیکھ لیتے؟ ایسے ہی کھیلتے رہے تو ماں باپ کی ساری ''۔۔۔۔'' جائداد کھو بیٹھو گے۔ ابے یہ آرٹ ہے آرٹ! کوئی بزازہ تھوڑی ہے!''

خلیل خاںؔ اس کی باتوں پر بھنا ہی تو جاتے۔ ابے تبے سے جواب دیتے اور اگلی مرتبہ اس سے نمٹ لینے کی گھسی پٹی دھمکی دیتے ہوئے پاؤں پٹخ کر میز سے اٹھ جاتے۔ ویسے وہ خوب جانتے تھے کہ مختار بیڑیؔ کی ہار کا زمانہ آنے میں کم از کم ایک قیامت کا وقفہ تو ضرور ہی تھا۔

ہم چاروں بچپن کے ساتھی تھے اور دنیا جہان کے وبال ساتھ ہی کاٹ چکے تھے۔ مختار بیڑیؔ کا تخلص اس چاند مارکہ بیڑی کا مرہون منت تھا جو اس کے پان سے کتھئی ہونٹوں میں ہر وقت آویزاں رہا کرتی تھی۔ مختارؔ اور بیڑی برسوں سے ایسے لازم وملزوم ہو کر رہ گئے تھے کہ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ گالیاں تو شاید اس کی گھٹی میں ڈالی گئی تھیں۔ ایسی روانی سے دیتا کہ بعض اوقات سننے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی ماں یا بہن کو مختارؔ نا گفتہ بہ الفاظ میں یاد کر رہا ہے۔ ویسے وہ تھا بالکل بے ضرر آدمی! ہم لوگوں نے اس کی گالیوں کا برا ماننا مدت سے چھوڑ دیا تھا۔

تاش کی بازی مختار بیڑیؔ کے گھر پر ہی جما کرتی تھی۔ اور کہیں بھلا یہ دھما چوکڑی ہوتی بھی کیسے؟ میرے گھر میں اگر اباؔ جی کو علم بھی ہو جاتا کہ میں ایسے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں جن کا شمار ان کی لغت میں ''لچوں، لفنگوں'' میں ہوتا تھا تو میری عاقبت خراب ہونے میں تو شاید کچھ وقت لگتا بھی، البتہ دنیا فوراً'' سے پیشتر بگڑنے کا بہت قوی امکان تھا! چنانچہ میرا مکان اس چنڈال چوکڑی کی یورش سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو کر رہ گیا تھا۔ سید کاظم حسینؔ کا گھر استعمال ہو سکتا تھا لیکن اس ناجائز عمل سے اس کو اپنی عاقبت بگڑتی نظر آتی تھی۔ اپنے آپ کو وہ صوم وصلوۃ کا پابند، بڑا اچھا مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ تاش صرف نمازوں کے اوقات کے درمیان ہی کھیلتا تھا اور اگر بھولے چوکے کسی دن کچھ جیت جاتا تو اس کا ایک حصہ خیرات کی مد میں رکھ لیتا تھا۔ ہمیں تو وہ اپنے کاموں میں ایک عام آدمی ہی لگتا تھا۔ چھوٹے موٹے جھوٹ بولنے میں اسے عار نہیں تھا۔ دفتر سے چھٹی وہ فرضی بیماری کے بہانے بنا کر لینے اور چار مینار سگریٹ کو کیونڈر کی ڈبیا میں رکھ کر دوستوں پر جھوٹا رعب جمانے کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ ایسی چھوٹی موٹی باتیں اس کی ان نیکیوں سے چھپ جائیں گی جن کا نمونہ دیکھنے کا فخر اب تک ہم گناہ گاروں کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ چھوٹے گناہوں سے اس کے جنت کے درجہ میں معمولی سی کمی تو ہو سکتی ہے مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ دروازہء جنت ہی اس پر بند کر دیا جائے۔ وہ اپنی بیٹھک میں جوئے کی اجازت بھلا کس طرح دے سکتا تھا؟

مختار بیڑیؔ اکثر سید کاظم حسینؔ کے اس برخود غلط اسلام کے لتے لیتا: ''ابے سالے! یہ کیا اسلام اسلام لگا رکھا ہے۔ ''۔۔۔'' دنیا میں کسی لونڈیا کا کبھی کچھ بگاڑا ہے جو جنت میں حوروں کا کچھ کر سکے گا!''

اس پر سید کاظم حسینؔ قرات سے لاحول ولاقوۃ پڑھ کر مختارؔ کو خونخوار آنکھوں سے گھورتا اور فٹافٹ تاش کے پتے پھینٹنے لگتا۔ خلیل خاںؔ کو اپنی بیٹھک میں تاش کی محفل جمانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا مگر بقیہ تین ساتھیوں کو اس تجویز پر بڑا اعتراض تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ خلیل خانؔ کی بیگم کی جانب سے کوئی خدشہ تھا۔ بقول مختار بیڑیؔ وہ تو ''اللہ میاں کی گائے'' تھیں اور اپنی دریا دلی اور مہمان نوازی کا کافی ثبوت خلیل خانؔ کو پچھلے دس سال میں سات بچے فراہم کر کے پہلے ہی پیش کر چکی تھیں! ہم لوگوں کا مشترکہ اور قطعی فیصلہ یہ تھا کہ جس گھر میں مختلف سائز کے سات بچے چل پوں مچائے رہتے ہوں وہاں یکسوئی سے نہ تو عبادت ہی ہو سکتی ہے اور نہ تاش کی بازی! بلکہ مختار بیڑیؔ کا تو ذاتی عقیدہ یہ تھا کہ ایسے گھر میں نماز بھلے ہی ہو جائے، جوا ہرگز نہیں ہو سکتا ہے!

خلیل خانؔ بھی بچوں کی اس بھرمار سے کچھ ایسے خوش نہیں تھے۔ گھر میں صبح سے شام تک قیامت تو خیر بپا ہی رہتی تھی، مگر اس ''تو چل، میں آیا'' والی کیفیت کا سب سے خراب پہلو یہ تھا کہ اخراجات کی کثرت سے اکثر خاں صاحبؔ کی جیب خالی ہی رہا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو کھیل کے دوران ہی انہیں مختار بیڑیؔ سے پیسے ادھار مانگنے پڑ جاتے تھے۔ آخر وہی سوچئے کہ پہلے وہ پیسے ہارتے تھے، پھر انہیں پیسوں کو مختار بیڑیؔ سے کل کی ادائیگی کے وعدہ پر ادھار مانگ لیتے تھے اور پھر دوبارہ ہار جاتے تھے! گویا ایک طرف اگر انہیں ہار کا کریلا بادل نخواستہ چبانا پڑتا تھا تو دوسری طرف یہ کریلا مختار بیڑیؔ کے نیم پر چڑھا ہوا ہوتا تھا۔ یہ بات جس قدر خلیل خانؔ کے لئے شرم اور ذلت کا باعث تھی، اسی قدر وہ مختار بیڑیؔ کے لئے مذاق اور بے ہودگی کا بہانہ بھی تھی۔ وہ یوں ہی کب چوکتا تھا۔ پھر خان صاحبؔ کا تاش کی میز پر ادھار مانگنا بھلا کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مختار بیڑیؔ اس لپیٹ میں خلیل خانؔ کے بچوں کو بھی سمیٹنے سے باز نہیں آتا تھا۔

''ارے بھئی خانصاحبؔ یہ سالے بچے پیدا کرنا تمہاری سائڈ بزنس ہی کیا؟ ''۔۔۔'' شادی کو کل دس سال ہوئے ہیں اور بچے ہو گئے سات! یہی حال رہا تو بیٹا تین چار سال میں پوری کرکٹ ٹیم تیار ہو گی گھر میں! ارے، بھابھی پر کچھ تو رحم کرو خان صاحبؔ! کیا دعائیں دیتی ہو گی وہ بیچاری تمہاری ''۔۔۔'' جان کو!'' وہ آنکھ مار کر کہتا۔

خلیل خانؔ جھلا ہی تو جاتے۔ ویسے بچوں کی افراط تھی بھی ان کی دکھتی رگ۔ ''دیکھ یار! تو میرے ذاتی معاملات میں نہ بولا کر، اچھا؟ تجھ سے مطلب کیا میرے بیوی بچوں سے؟ اپنے کام سے کام رکھ!''

''ذاتی معاملات؟ ابے الو کی دم، کون سے ذاتی معاملات؟ تیرے کوئی پبلک معاملات بھی ہیں جن پر بولا جا سکے؟ سالے تیرے تو ذاتی معاملات بھی اب پبلک

معاملات ہو کر رہ گئے ہیں!''

خلیل خاںؔ معاملہ بگڑتے دیکھ کر منھ ہی منھ میں مختار بیڑیؔ کو دو چار گالیاں دے کر خاموش ہو جاتے اور غصہ میں غلط پتا چل جاتے۔ عمر بھر کی دوکانداری نے انہیں مصلحت پہچاننا خوب سکھا دیا تھا۔

دراصل خلیل خاںؔ کے بچے ہی اس قصہ کا موضوع ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ اگر بات اتنی سی ہی تھی تو پھر یہ ادھر اُدھر کے پن چھلے اس میں کیوں لگائے گئے ہیں۔ تو صاحب! ایک تو قصہ میں راوی کا ذہن و زبان کبھی کبھی ان جانے میں (اور بیشتر دانستہ!) بھٹک ہی جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ ان باتوں سے قصہ کا لطف بڑھ گیا ہے کہ نہیں؟

تو واقعہ یوں ہے کہ خلیل خاںؔ اولاد کی بہتات سے پریشان رہتے تھے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہر شخص سے ''ہم دو، ہمارے دو'' کے سرکاری فارمولے پر عمل کر کے آبادی قابو میں رکھنے کی امید کی جاتی ہے، خلیل خاںؔ کے سات بچے اس زخمی انگوٹھے کی طرح سب کی نگاہوں میں فوراً'' آ جاتے تھے جس پر چار انگلیوں کے درمیان پٹی بندھی ہوئی ہو۔ مختار بیڑیؔ سے تو ذکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ مجھ کو اپنا ہمدرد جان کر وہ کبھی کبھی شکایت کرتے تھے:

''یار! بڑی پریشانی ہے۔ خاندان ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ خرچ کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے، اور آمدنی وہی ایک دوکان والی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔''

ان کے لہجہ سے ٹپکتی بیچارگی کے باوجود ایسی نامعقول شکایت پر مسکراہٹ روکنی مشکل ہو جاتی۔ وہ ایسی مسمسی صورت بناتے جیسے اس مسئلہ کی روز بروز ترقی میں ان کا کوئی ہاتھ ہی نہیں تھا! بہر حال وہ دوست تھے۔ میں ہمدردی جتاتے ہوئے کہتا:

''اماں! تم تو عجیب بات کرتے ہو۔ بھابی کو مسلم یونیورسٹی میڈیکل کالج میں لے جا کر ان کا آپریشن کیوں نہیں کرا دیتے ہو، نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری!''

میری اس تجویز پر خلیل خاںؔ کی پریشانی اور بڑھ جاتی اور وہ بوکھلا کر کہتے: ''ارے باپ رے باپ! ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ سارے کے سارے سرجن مرد ہیں وہاں! بھلا بیگم کو میں ان کے سپرد کیسے کر سکتا ہوں؟ شرم و حیا اور بزرگوں کی کمائی ہوئی عزت کیسے خاک میں ملا دوں؟ خود بیگم بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گی۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ تمام شہر اور برادری کو خبر ہو جائے گی۔ منھ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا کہیں!''

میں نے منطق بگھارتے ہوئے کہا: ''اس میں بدنامی کی کیا بات ہے خان صاحبؔ؟ اگر بیوی کو کوئی اور مرض ہوتا تب بھی تو انہیں مرد ڈاکٹروں سے علاج کرواتے۔''

''نہیں بھائی نہیں! وہ اور بات ہے اور یہ اور۔ کوئی دوسرا حل سوچو اس مسئلہ کا۔'' وہ سر ہلا کر بڑی سنجیدگی سے کہتے۔

آخر ایک دن میں جھلا ہی تو گیا۔ ''یار، یہ تم نے کیا روز روز کی چپقلش لگا رکھی ہے؟ ارے بیگم کا آپریشن نہیں کراتے ہو تو خود اپنی نس بندی کیوں نہیں کرا لیتے؟''

خلیل خاںؔ نے مجھ کو ایسے دیکھا جیسے میں گھاس کھا گیا ہوں۔ انہوں نے غرا کر کہا: ''کچھ سنک گئے ہو کیا؟ اور دنیا میں میرا فضیحتہ کراؤ گے کیا؟ یہی سالے ڈاکٹر سب میں بات پھیلا دیں گے اور پھر میرا وہ مذاق بنے گا کہ دماغ صحیح ہو جائے گا۔''

میں نے عاجز آ کر کہا: ''بھئی کچھ کرو مگر اس قضیہ کو ختم کرو! دلّیؔ ہی چلے جاؤ۔ چاندنی چوکؔ میں ڈاکٹر آہوجہ بڑا مشہور ہے۔ چپکے سے وہیں آپریشن کروا آؤ۔ علیگڑھؔ والوں نے دلّیؔ میں تمہارے خلاف کون سے جاسوس پھیلا رکھے ہیں کہ سارے میں بات پھیلا دیں گے؟''

میری اس تجویز پر خلیل خاںؔ اچھل پڑے۔ ''یار کیا سجھائی ہو تو نے! اس سے بڑھیا بات تو ہو ہی نہیں سکتی ہے! دلّیؔ میں میری سسرال بھی ہے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔ بس اب یہی کرنا ہے۔''

اور اس کے ایک مہینہ کے بعد ہی خلیل خاںؔ نے بزازہ کی دوکان کا کام اپنے چھوٹے بھائی کو سونپا اور ایک نہایت قریبی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے دہ ہفتے کے لئے دلّیؔ چلے گئے۔ البتہ شادی کی سراسیمگی میں وہ لوگوں کو یہ بتانا بھول گئے کہ اس اشد ضروری تقریب میں اپنے بیوی بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لے گئے تھے! اور یہ بھی کہ یہ شادی کس پیمانہ پر ہو رہی تھی جو ان کی موجودگی دلّیؔ میں دو ہفتوں کے لئے درکار تھی! معلوم نہیں خلیل خاںؔ کی بیگم نے اپنی سہیلیوں کو کیا پٹی پڑھائی، بہر حال دنیا اپنے کاموں سے لگی رہی، ہماری تاش کی محفل معطل رہی (جس کا مختار بیڑیؔ کو فطری طور سے سب سے زیادہ ملال تھا کہ مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔) اور ایک شام خلیل خاںؔ شادی سے فارغ ہو کر ہشاش بشاش، مسکراتے ہوئے واپس آ گئے۔ چلنے پھرنے میں قدرے تکلف ظاہر ہو رہا تھا جس کی وجہ انہوں نے دلّیؔ میں شادی کے ہنگامہ میں لگنے والی کمر کی چوٹ بتائی۔ اس ظالم چوٹ نے انہیں کرسی پر جم کر بیٹھنے اور تاش کھیلنے سے ایک ہفتہ اور مجبور رکھا، جس پر مختار بیڑیؔ نے نہایت خلوص دل سے انہیں کئی سڑی سڑی گالیاں دیں۔ ان گالیوں

کا خلیل خانؔ پر حسب معمول کوئی اثر نہیں ہوا۔ البتہ جب مختار بیڑیؔ نے ان کو ''مردود نامرد'' کے معزز لقب سے نوازا تو ان کے چہرہ پر لمحہ بھر کہ ایک غبار سا آ کر رہ گیا جس کو مختارؔ کی چندھی آنکھیں تو نہ دیکھ سکیں مگر میری راز دار نگاہوں سے خان صاحبؔ کی اندرونی سراسیمگی چھپ نہیں سکی۔

وقت گذرتے کیا دیر لگتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے خلیل خانؔ کی کمر کی چوٹ بالکل ٹھیک ہوگئی، وہ کرسی پر جم کر بیٹھنے کے قابل پھر سے ہو گئے اور بیٹھک تاش کی چٹاخ پٹاخ، چائے کی پیالیوں کی کھنکھناہٹ اور مختار بیڑیؔ کی مرغن گالیوں سے دوبارہ جاگ سی گئی۔

اور خلیل خانؔ کی دلّی سے واپسی کے کوئی دو ماہ بعد ان کی بیگم نے بڑی پریشانی کے عالم میں آنکھوں میں آنسو بھر کر انہیں ڈرتے ڈرتے اطلاع دی کہ ان کا پیر پھر بھاری ہو گیا تھا! یہی وہ دن تھا جب خلیل خانؔ کے ہاتھوں کے طوطے پھرر رر سے اڑ گئے تھے اور وہ حواس باختہ ہو کر دوسروں کا منھ تکتے رہ گئے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ بھی پیش آیا وہ میں نے خلیل خانؔ سے یا میری بیوی نے بیگم خلیل خانؔ سے سنا تھا جو اِن دنوں نے نہایت دبے دبے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ اس رازداری پر بڑی قسما قسمی ہوئی تھی۔ میں بھی آپ کو یہ تفصیل اس شرط پر سنا رہا ہوں کہ اس کا چرچا آپ کسی سے نہیں کریں گے، خصوصاً ''اس کا خیال رکھیں گے کہ یہ بات مختار بیڑیؔ تک ہرگز نہ پہنچنے پائے۔ یہ خصوصیت والی بات مجھے یوں کہنی پڑی کہ آپ لاکھ قسموں کے باوجود یہ قصہ اپنی بیگم سے تو ضرور ہی مزے لے لے کر بیان کریں گے کیونکہ ایسا کرنا ہماری سماجی روایات کا ایک اہم حصہ ہے!

تو خیر، ہوا یوں کہ خلیل خانؔ اپنی بیگم سے یہ خبر سن کر کچھ دیر تک تو سکتہ میں رہ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر سر جھٹک کر یوں بولے جیسے ان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ایں کیا کہا۔ پاؤں بھاری ہے تمہارا؟ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ بھلا اب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ان کی آواز میں غم و غصہ اور تعجب کی ملی جلی گھن گرج تھی۔

بیگم کی ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ غریب خود پریشان اور حیران تھی۔ ''جی میں کیا بتاؤں۔ میں تو خود حیران ہوں۔ ڈیڑھ ماہ چڑھ گئے ہیں۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ صبح سویرے متلی کی بھی وہی پرانی حالت ہے۔'' انہوں نے دبی زبان سے کہا۔

''مگر یہ آخر ہو کیسے سکتا ہے؟ میں تو دلّی ڈاکٹر آہوجہؔ کے پاس ہو آیا۔ اب بچہ کا کیا سوال ہے؟'' پھر انہوں نے شک بھری نظر سے بیگم کو دیکھ کر بڑے گمبھیر لہجہ میں پوچھا:

''سچ سچ کہو کہ یہ کیا قصہ ہے؟ دال میں کیا کالا ہے؟ یہ پاؤں کیسے بھاری ہوا، کون ہے وہ مردود؟''

بیگم کی چیخ نکل گئی: ''ہائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اللہ! آپ یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ توبہ توبہ! کچھ تو خدا کا خوف کیجئے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''اگر کوئی چکر نہیں ہے تو یہ بچہ میرا تو نہیں ہو سکتا ہے۔ آخر ہے کس کا؟ خدا کی قسم! میں تم کو اور اس مردود کو جان سے مار دوں گا اور خود پھانسی چڑھ جاؤں گا۔'' خلیل خانؔ غصہ سے کانپتے ہوئے بولے۔

''یا اللہ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے بارے میں آپ کے منھ سے یہ کیا نکل رہا ہے؟ اللہ میری توبہ ہے۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟'' بیگم کا برا حال ہو رہا تھا اور اسی حساب سے خلیل خانؔ کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ وہ بیگم کی کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ بس یہ ہی رٹ تھی کی بتاؤ یہ کس کی حرکت ہے!

آخر عاجز آ کر ان کی بیگم چیخ ہی تو پڑیں ''معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے۔ آپ اپنا معائنہ میڈیکل کالج میں کیوں نہیں کروا لیتے جو صحیح حال معلوم ہو جائے؟''

خلیل خانؔ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں: ''میڈیکل کالج؟ معائنہ؟ ارے کیسا میڈیکل معائنہ؟ ابھی تو پانچ ہزار روپے دے کر ڈاکٹر آہوجہؔ سے آپریشن کروا کر آیا ہوں۔ ساری دنیا میں اس کا نام ہے۔ اس سے اچھا سرجن تو دور دور تک نہیں ہے۔ اور تم معائنہ کی بات کرتی ہو؟ ہوش کی بات کرو ہوش کی!''

معلوم نہیں کہ اس جھگڑہ کی تان کہاں ٹوٹی۔ بہر حال دوسرے دن خلیل خانؔ نے مجھ سے بیوی کی اس تجویز کا ذکر کیا تو میں نے ان کو سمجھایا: ''یار! تم بھابی کے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟ یہ تو نہایت غلط بات ہے۔ اور وہ جو معائنہ کو کہہ رہی ہیں تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ تمہارا بھی اطمینان ہو جائے گا اور یہ مسئلہ بھی نمٹ جائے گا۔''

خلیل خانؔ کچھ شرمندہ سے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ بیگم پر الزام لگا کر اب پچھتا رہے تھے۔ ہکلا کر بولے: ''مگر یار! میں تو ڈاکٹر آہوجہؔ۔۔۔''

میں نے بات کاٹتے ہوئے کچھ خفگی سے کہا: ''چھوڑو بھئی، گولی مارو ڈاکٹر آہوجہؔ کو۔ تم میڈیکل کالج کے ڈاکٹر شاداب سے معائنہ کروا لو۔ کیا ہرج ہے اس میں؟''

اور وہ تھوڑی سی بحث کے بعد اس پر راضی ہو گئے کہ دو ایک دن میں ڈاکٹر شاداب احمدؔ سے معائنہ اور ٹیسٹ کرا لیں گے۔ دوسرے ہی دن میں ایک کام سے کانپورؔ چلا

گیا۔ تین ہفتے بعد واپس آ کر مختار بیڑؔی کے گھر گیا۔ سوچا تھا کہ اس کے ساتھ پھر تاش کی بازی کا پروگرام طے کروں گا مگر وہ بیڑی کا دھواں منھ اور ناک سے چمنی کی طرح فوں فاں نکالتا ہوا عجیب خراب موڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے کچھ حیرت سے پوچھا: ''ابے یہ کیا ہو گیا تجھے جو یوں زندگی سے بیزار ہے؟''

اس نے منھ سے بیڑی تقریباً'' جھپٹ کر زور سے نالی میں دے ماری اور غرایا: ''ابے سالے مجھ سے کیا پوچھتا ہے؟ اس ''۔۔۔'' چڑی مار خلیل خاںؔ سے جا کر پوچھ۔ سالا، ملاٹا کہیں کا! کہتا ہے تاش حرام ہے۔ الو کی دم!''

میں نے اور بھی حیران ہو کر پوچھا: ''ملاٹا؟ کون ملاٹا؟ کون تاش کو حرام کہہ رہا ہے؟''

''ارے وہی خلیل خاںؔ کا بچہ اور کون؟ ''۔۔۔'' کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' مختار بیڑؔی نے بڑی بیزاری سے کہا۔

میری سمجھ میں اس کی مسلسل گالیوں سے آراستہ تقریر سے صرف اس قدر آیا کہ خلیل خاںؔ کا دماغ خراب ہو گیا ہے، وہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے اور تاش کو حرام کہتا ہے۔ یہ ایسی بات تھی جس کی ذاتی تصدیق ضروری تھی۔ یا تو واقعی خان صاحبؔ پاگل ہو گئے تھے یا پھر مختار بیڑؔی نے بیڑی کے علاوہ بھانگ یا چرس سے بھی شوق کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے کہنے سننے سے مختار بیڑؔی میرے ساتھ خلیل خاںؔ کے گھر چلنے کو تیار ہو گیا۔ سارے راستہ اس غریب کی ماں، بہن سے مختلف قسم کے رشتے جوڑتا رہا، اور ٹیپ کے بند کے طور پر مجھے بہ آواز بلند خلیل خاںؔ کے بہت جلد ہونے والے قتل کا یقین دلاتا رہا۔ یہ دوسری بات کچھ کچھ میری سمجھ میں بھی آتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو جس نے مختار بیڑؔی کی مستقل آمدنی بند کر کے بقول شخصے اس کے ''پیٹ پر لات ماری ہو'' جینے کا حق بھلا ہو بھی کیسے سکتا تھا؟

خلیل خاںؔ کے گھر کی گھنٹی بجائی گئی تو اولاد نمبر ایک نے باہر آ کر اطلاع دی کہ: ''ابوؔ نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ آپ لوگ بیٹھک میں بیٹھ جائیں۔''

اس دعوت پر مختار بیڑؔی نے بھنا کر خلیل خاںؔ اور وظیفہ کو ایک ہی سانس میں ماں کی گالی دی اور پلٹ کر میرے ''ارے، سن تو! اے ے ے'' کہتے کہتے الٹے پیروں گلی سے باہر نکل گیا۔ میں لاحول پڑھتا ہوا بیٹھک میں چلا گیا، مگر دماغ کو سکون کہاں تھا؟ خلیل خاںؔ، نماز، وظیفہ؟ آخر یہ کیا معمہ تھا؟

تھوڑی دیر میں خلیل خاںؔ مسکراتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے تو میں ان کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ میلے گیروے کرتہ پر اُٹنگا پاجامہ پہنے، سر پر چٹائی کی گول ٹوپی منڈھے اور ہاتھ میں تسبیح لٹکائے وہ سرکس کا مسخرہ کی طرح بے تحاشہ دانت نکوسے مسکرائے جا رہا تھا۔ چہرہ پر مدتوں کا بڑھا ہوا خط آنے والی بھیانک داڑھی کی خبر دے رہا تھا۔ مجھے اس کو پہچاننے میں چند سیکنڈ تو لگ ہی گئے ہوں گے۔

میں نے ہکلا کر پوچھا: ''ابے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ خیریت تو ہے؟''

''ہاں، ہاں، سب اللہ کا احسان ہے۔ الحمدللہ! الحمدللہ!'' انہوں نے بڑے خضوع سے تسبیح لہرا کر اعلان کیا۔

''یار تجھے کیا ہو گیا ہے؟ مختار بیڑؔی ٹھیک ہی کہتا تھا کہ تو بہک گیا ہے۔ یہ نماز، وظیفہ کب سے شروع کر رکھا ہے؟''

''مختؔار بھائی تو خواہ مخواہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ میں اللہ کے فضل سے سیدھی راہ پر آ گیا تو اس میں غصہ گرمی کی کیا بات ہے؟ اللہ ہر ایک کو ایسی ہی نیک توفیق عطا فرمائے۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبہ میں چلا گیا۔

اب میں گھبرا گیا تھا: ''ابے یہ: مختؔار بھائی: کب سے ہو گئے تیرے؟ یہ سالا کیا چکر ہے؟ بھابی تو خیریت سے ہیں نا؟''

''ہاں ہاں! بھابی ماشاءاللہ خیریت سے ہیں۔ مگر تیرا حال کیوں بیرنگ ہو رہا ہے؟'' خلیل خاںؔ نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ میں واقعی خلیل خاںؔ سے ہی بات کر رہا تھا: ''یار! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ مختار بیڑؔی کہتا ہے کہ تو نے تاش کھیلنا چھوڑ دیا ہے بلکہ اب تاش کو حرام کہتا ہے۔ حلیہ تیرا میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ بھابی کو بھی تو خیریت سے بتاتا ہے۔ بے وجہ بے وقوفوں کی طرح مسکرائے چلا جا رہا ہے۔ یہ بتا کہ ڈاکٹر شاداؔب سے ملا تھا کہ نہیں؟'' اب میرے لہجہ سے سراسیمگی ظاہر ہو رہی تھی۔

خلیل خاںؔ کی مسکراہٹ پھیل کر ذرا سی اور پراسرار ہو گئی تھی۔ ''ہاں ہاں! گیا تھا۔ سبحان اللہ! کیا قدرت ہے اس پروردگار کی! اگر میں تیری بات مان کر ڈاکٹر شاداب احؔمد کے پاس نہ جاتا تو ابھی تک گناہوں میں پھنسا ہوتا۔ دنیا تو میری خراب تھی ہی، عاقبت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔''

اب معاملہ حد سے بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ میں اور الزام تو برداشت کر سکتا تھا لیکن یہ بات میری عقل سے بالکل ہی باہر تھی کہ میری وجہ سے خلیل خاںؔ اللہ کی قدرت ظاہر ہوئی تھی اور اس کی موجودہ حالت کا میں ہی براہ راست ذمہ دار تھا!

''ابے، یہ کیا اناپ شناپ لگا رکھی ہے تو نے؟ آخر ڈاکٹر شاداب احمد نے معائنہ کے بعد کیا کہا؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

خلیل خاںؔ نے اپنی آنکھیں آدھی بند کر کے مجھ کو بڑے رحم سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا: ''اناپ شناپ؟ ابے تجھے میری باتیں اناپ شناپ لگتی ہیں؟ ڈاکٹر شاداب احؔمد نے مجھ پر اللہ تعالی کی قدرت سے پردے اٹھا دئے۔ اور جس پر اللہ کا ایسا کرم ہو اس کو اور کس چیز کی ضرورت ہے؟''

''بھائی مجھے معاف کر دے! بس یہ بتا دے کہ ڈاکٹر شاداب احؔمد نے کیا کہا جو تو ایسا اللہ والا ہو کر رہ گیا ہے؟'' میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

خلیل خاںؔ نے تسبیح مٹھی میں بھینچ کر سینہ سے لگا لی اور آنکھیں بند کر کے بولا: ''میاں! ڈاکٹر شاداب احؔمد نے بتایا کہ ڈاکٹر آہوجہؔ نے اپنی سرجری لگا کر جو راستہ بند کیا تھا، اللہ تعالی نے اپنی بے پناہ قدرت سے اس کو دوبارہ کھول دیا ہے!! سبحان اللہ! سبحان اللہ!''

مَلیچھ

(ملیچھ ہندی میں ناپاک شخص کو کہتے ہیں جس کے چھونے سے چیز ناپاک ہو جاتی ہے اور برہمن اس کو استعمال نہیں کر سکتا ہے)

''ملیچھ! کل موہی! بھگوان تیرا ستیاناس کرے! آگ لگے تیرے گھر کو، چُڑیل کہیں کی! دیکھ کر تو جیسے اس کو چلنا آتا ہی نہیں ہے۔ پچھلے مہینے بھی تو نے یہی کیا تھا اور آج پھر مَو کا دیکھ کر بے ایمان ہاتھ سا پھ کر گئی! لگاؤں ابھی دو ہاتھ تو دِماگ ٹھیک ہو جائے گا۔''

کلیانیؔ نے غصہ سے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور پھر یک لخت رک گئی۔ اس ملیچھ کو ہاتھ لگائے گی تو خود گندی ہو جائے گی۔ اشنان کرنا ہوگا اور کپڑے بھی بدلنے ہوں گے۔ سراسر نقصان اپنا ہی ہوگا۔ اس کلموہی کا کیا بگڑے گا؟ یہ تو ہے ہی گالیاں اور مار کھانے کی عادی۔ روز روز کی شرارت سے تنگ آ کر آج اس کے غصہ کا پارہ بے حد اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس کا چمپئی رنگ تمتما کر تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ آنکھیں سرخی مائل ہو رہی تھیں اور ماتھے پر پسینہ کی بوندیں دمک رہی تھیں۔ غصہ میں اس کو ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ ہمیشہ سر پر ڈھکا رہنے والا ساری کا پلّو ڈھلک کر شانوں سے ڈول رہا تھا۔

''ملیچھ! کمینی! چل نکل یہاں سے!'' وہ چیخ کر بولی۔

اُدھر رام دئیؔ دیوار سے لگی سر جھکائے ایسے کھڑی تھی جیسے خوف اور احساس جرم سے واقعی سہم کر رہ گئی ہو۔ لیکن اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے ڈھونگ کا سارا بھانڈا پھوڑے دے رہی تھیں۔ کلیانیؔ سے اس کے ہتھکھنڈے چھپے ہوئے نہیں تھے مگر رام دئیؔ کے چلتّر کے آگے وہ بھی ہار مان گئی تھی۔ آخر وہ کرتی تو بھی کیا کرتی؟ اس کے ہاتھ پیر ایسے موقعوں پر جیسے بندھ جایا کرتے تھے۔ صرف ایک زبان ہی کھلی رہ جاتی تھی، تو رام دئیؔ ایسے چکنے گھڑے پر اس کی باتوں اور ڈانٹ کا بھلا کیا اثر ہونا تھا! وہ سر جھکائے آج بھی گالیاں کھا رہی تھی۔ اگر کلیانیؔ غور سے دیکھتی تو یہ گالیاں رام دئیؔ کے ایک کان میں داخل ہو کر دوسرے سے باہر نکلتی صاف نظر آ رہی تھیں! البتہ رام دئیؔ کی تین سال کی لڑکی نندیؔ اس چیخ پکار سے ڈر کر ماں کی ساری میں منھ دئے سہمی سہمی نظروں سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔

رام دئیؔ نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کلیانیؔ کو دیکھا اور کہا: ''ارے بہو جی! گلتی ہو گئی۔ نجر نہیں پڑی اور پیر پھسل گیا۔ رام جانے کوئی جان بوجھ کر تھوڑی ایسا کروں ہوں۔ چاہے اپنی کسم لے لو!''

کلیانیؔ نے اس کی دیدہ دلیری پر بھڑک کر کہا: ''ہاں! تو ایسی ہی تو ستی ساوتری ہے! ہر دوسرے تیسرے ماہ تجھ سے ایسی ہی گلتی ہو جاتی ہے۔ پھر کسم بھی کھائے گی تو جنم جلی میری! ارے تو بڑی چالو عورت ہے۔ جبھی تو مسیتاؔ تجھ سے پریشان رہتا ہے۔ آئی وہاں سے کسم کھانے والی۔ ملیچھ کہیں کی!''

مسیتاؔ کی پریشانی کا سن کر رام دئیؔ کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی آ گئی: ''ارے بہو جی! وہ کب مجھ سے ناراج رہتا ہے؟ یہ دیکھو، پرسوں ہی نئی چوڑیاں اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پہنائی ہیں!'' اس نے فخریہ شرارت سے کہنیوں تک کانچ کی کھنکھناتی ہوئی دھانی چوڑیوں سے بھرے ہاتھ کلیانیؔ کے سامنے پھیلا دئے۔

کلیانیؔ اس کی ہنستی ہوئی آنکھوں اور ٹھنکتی ہوئی آواز پر اپنی مسکراہٹ مشکل سے ہی روک سکی۔ ابھی وہ رام دئیؔ کو جواب دینے ہی والی تھی ک آنگن کی دیوار کے اوپر سے بابو دین محمدؔ کی بیوی راشدہؔ کا سر ابھرا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی دیوار کے سہارے پلنگ کھڑا کر کے اس سے سیڑھی کا کام لے رہی تھی۔

راشدہؔ نے پوچھا: ''ارے کلیانیؔ! کیا ہو گیا جو اتنا غصہ کر رہی ہو؟ کیا کر دیا رام دئیؔ نے؟''

''دیدی! کیا بتاؤں، وہی روج روج کا جھگڑا ہے۔ آج پھر اس ملیچھ جنم جلی نے آنگن میں آ کر پرانا ناٹک کھیلا۔ جان بوجھ کر پھسل پڑی اور پلنگ پر سوکھتی ہوئی بڑیوں کو چھو کر بھرشٹ کر دیا! اب تم ہی کہو، میں کیا کروں اس کمینی کا؟'' کلیانیؔ نے روہانسی ہو کر بیچارگی سے پلنگ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا جس پر بچھے سفید کپڑے پر اس نے آج صبح

ہی آدھ سیر مونگ کی بڑیاں بنا کر سوکھنے کو پھیلائی تھیں۔

راشدہ یہ منظر اس سے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ اس نے رام دئی کو پھٹکارا: ''اللہ ماری، کم بخت! تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی۔ معلوم ہے نا کہ کلیانی اب تجھے یہ بڑیاں دے دے گی۔ تبھی یہ حرکت کرتی ہے۔'' پھر وہ کلیانی سے مخاطب ہو کر بولی: ''کلیانی! اس بدمعاش کو خبردار جو تم نے بڑیاں دیں۔ پھینک دو انہیں۔ تم نے بھی تو دے دے کر اس کی عادت خراب کر دی ہے۔ کسی طرح تو اس بدذات کی عادت چھوٹے۔ ویسے اس نے جدھر کی بڑیاں چھولی ہیں ادھر کی بڑیاں پھینک کر باقی تم رکھ کیوں نہیں لیتیں؟ کون سا اس نے ساری بڑیوں کو ناپاک کر دیا ہے؟''

کلیانی منھ بنا کر بولی: ''دیدی، تم ٹھیک کہتی ہو پر میرا من نہیں مانتا ہے۔ دھرم کرم کی بات ہے نا!''

پھر اس نے کپڑے میں ساری بڑیاں سمیٹ کر پوٹلی رام دئی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: ''لے مر، ملچھ کہیں کی! اور نکل گھر سے باہر۔ اب بنا بلائے اگر آئی تو جوتے لگا کر نکال دوں گی گھر سے، ہاں!''

رام دئی نے پوٹلی بغل میں دابی اور دروازہ کی جانب مسکراتی ہوئی چل دی: ''بہورانی! جگ جگ جیو! دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو! بھگوان تمہیں بہت سا دے۔''

اس کی ڈھٹائی پر راشدہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کلیانی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی، مگر مصنوعی غصہ سے منھ بنا کر رسوئی کی طرف مڑ گئی: ''ارے دیدی! تم کوئی کم ہو کیا؟ وہ کلموہی، چور میری بڑیاں لے گئی اور تم کھڑی کھل کھل ہنس رہی ہو۔ ایں نہیں تو!''

کلیانی اپنے ہنس مکھ مزاج کی وجہ سے محلّہ میں بہت ہر دل عزیز تھی۔ سب سے اچھی طرح مل لیتی تھی۔ ویسے وہ ہنستی ہوئی اچھی بھی بہت معلوم ہوتی تھی۔ مسکراتی تو گالوں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت گڑھے پڑ جاتے اور دیکھنے والے کی نظریں بے اختیار ان میں ڈوب جاتیں۔ کلیانی کو لوگوں کی بے محابہ نظروں کا احساس تھا اور وہ مسکراتی تو کوشش کرتی کہ کسی طرح ساری کا پلو دونوں گالوں کو چھپا لے۔ اس کی پڑوسن سہیلیاں اکثر اس کو چھیڑتی بھی تھیں:

''ہاں ہاں! چھپا لے گال! بس بھیا ہی انہیں دیکھیں! اور کوئی نہ دیکھ پائے!''

''اری کلیانی! تجھ کو تو فلموں میں ہونا چاہئے تھا۔ یہ مادھوری اور نرگس سب دھری کی دھری رہ جاتیں!''

''ہائے! سچ میں اگر آدمی ہوتی تو تمہارے گالوں کے کنویں میں ڈوب کر مر جاتی!''

کلیانی سب کی سنتی اور ہنس کر ٹال جاتی۔ ایسی باتوں کا کون برا مان سکتا تھا؟ پھر وہ دھرم کرم کی بھی بہت پابند تھی۔ پوجا پاٹھ، آرتی کیرتن، گیان دھیان، دان دکچھنا، ستیہ نارائن کی کتھا، کون سا ایسا دھرم کا کام تھا جو وہ پریم بھاؤ اور سادھنا سے نہیں کرتی تھی؟ بس اس کو یہ منظور نہیں تھا کہ کوئی کام دھرم کے اصولوں کے خلاف ہو جائے۔ دگمبر پرساد کو بھی شام کی آرتی پوجا کے بعد ہی بھوجن ملتا تھا اور صبح اٹھ کر من چاہے یا نہ چاہے اشنان کے بعد تلک لگا کر الٹا سیدھا جپ جی کا پاٹھ کرنا ہی پڑتا تھا۔ ان کی کلیانی سے اگر کبھی جھک جھک ہوتی تو اسی بات پر کہ وہ دھارمک باتوں میں کلیانی کی سخت مزاجی سے بعض اوقات کسمسا جاتے تھے۔

دگمبر پرساد دھرم کے معاملہ میں کچھ ایسے کٹّر نہیں تھے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب سے ہی گھل مل لیتے تھے اور موقع دیکھ کر کلیانی کی آنکھ بچا کر ان کے ساتھ چائے پانی کا شغل بھی کر لیتے تھے۔ وہ تو ان کے دوستوں نے ان کا بھانڈا سلامت رکھا ہوا تھا ورنہ کلیانی کو ان کے دھرم بھرشٹ کرنے والی حرکتوں کا پتہ چل جاتا تو ان کی شدھی ہی کر کے چھوڑتی!

پندرہ سال کلیانی کے ساتھ گذار کر اور چار بچوں کا باپ بن جانے کے بعد دگمبر پرساد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کب اور کس بات پر کلیانی کو دھرم کرم کا دورہ پڑے گا۔ جو گھر کے پوجا پاٹھ کے کمرہ میں کسی کو بغیر اشنان گھسنے نہیں دیتی تھی اور بابو دین محمد کے تین سالہ بچے مبین کو ملچھ سمجھ کر اپنی رسوئی کی چوکھٹ پر بھی قدم نہیں رکھنے دیتی تھی اس کلیانی سے دھرم کے معاملہ میں کسی نرمی کی امید بیکار تھی۔ پنڈت جی نے اس مسئلہ کا سیدھا سادا حل یہ نکالا تھا کہ جب کلیانی ان سے دھرم کے معاملہ میں آپے سے باہر ہونے لگتی تھی تو وہ اٹھ کر باہر کھسک جاتے اور سامنے پنالال پنواڑی کی دوکان پر بیٹھے دوستوں کی شطرنج کی بازی سے دل بہلانے بیٹھ جاتے۔ اگر ان کے اندازہ میں کلیانی کا غصہ اترنے میں معمول سے زیادہ وقت لگنے کی امید ہوتی تو ایک آدھ بازی پر خود بھی قسمت آزمائی کے لیتے تھے۔ وہاں سب ان کے دوست تھے۔ سب شادی شدہ تھے اور بقول بابو دین محمد ''اپنی اپنی بیویوں کے دبو غلام'' بھی تھے! وہاں پہنچ کر انہیں دوستی اور ہمدردی دونوں ہی ہمیشہ مل جاتی تھیں۔

''بیٹھو دگمبر بھیا، بیٹھو! آج بھوجی پھر کھپا ہو گئیں کیا؟ ارے پنالال جرا دگمبر بھیا کو بڑھیا مسالہ دار پان تو کھلا!'' مکٹ بہاری بساط پر پیدل بڑھاتے ہوئے کہتے۔

پنالالؔ فٹافٹ پان بناتے ہوئے فلسفہ بگھارتا: ''سالا روج روج کا یہی چکر ہے۔اپن کا حال بھی بس ایسا ہی سمجھو! میری مانو تو بھیا! کل یگ آ رہا ہے کل یگ! سارے آدمی اپنی اپنی عورتوں سے ڈر کر دم دبا کر گھر سے بھاگنے لگے ہیں۔ پہلے جمانے میں کوئی ایسا تھوڑی تھا۔عورت کچھ اینڈی بینڈی کہتی تو سالی کو مار مار کر بھرکس نکال دیتے تھے۔''

''ارے یار رہنے دے! سالا یہ جھگڑا کبھی نہیں نمٹا۔اب کیا نمٹے گا؟ عورت بھگوان نے چیج ہی ایسی بنائی ہے کہ نہ اس کے ساتھ رہ سکیں اور نہ ہی اس کے بنا جی سکیں! دھت تیری کی!'' رام بھروسےؔ گھوڑے کی ترچھی چال چلتے ہوئے بڑبڑایا۔

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو بھیا! گھر میں اگر کچھ شانتی چاہتے ہو تو جیادہ بولو چالو مت! جورو کا گسہ بہت کھراب چیج ہے۔بھگوان بچائے اس چلتر سے!'' مکٹ بہاریؔ جواباً ''بادشاہ کو قلعہ بند کرتے ہوئے بولے۔

بابو دین محمدؔ عموماً ''ایسے بات چیت کے درمیان پان چباتے ہوئے زیرلب مسکراتے رہتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ایسے زبانی جمع خرچ سے دل کی بھڑاس تو ضرور نکل جاتی تھی لیکن اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہاں بیٹھنے والوں میں کوئی ''گھوڑے والا'' نہیں تھا بلکہ سب کے ساب ''انڈے والے'' ہی تھے!

اب آپ پوچھیں گے کہ یہ ''گھوڑے والے اور انڈے والے'' کون لوگ ہیں تو صاحب! یہ قصہ آپ بابو دین محمدؔ سے خود ہی سن لیجئے!

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ملک کے بادشاہ کے کانوں تک یہ افواہ پہنچی کہ اس کی حکومت میں گھر گھر عورتوں کا راج تھا اور مردوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔اس نے اس افواہ کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے اپنے وزیراعظم کو مقرر کیا۔وزیر صاحب نے اپنے درباریوں سے مشورہ کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ اگلے دن شہر کے بڑے چوک میں برابر تعداد میں ایک طرف گھوڑے رکھ دئے جائیں اور دوسری طرف انڈے۔اس دن چوک سے جو شخص گذرے اس سے پوچھا جائے کہ ''تمہارے گھر میں کس کا راج ہے، تمہارا یا تمہاری بیوی کا؟''

اگر وہ شخص خود کو اپنے گھر کا مالک بتائے تو اس کو ایک گھوڑا دے دیا جائے اور اگر بیوی کا حکم چلنے کا اقرار کرے تو اس کو ایک عدد انڈا تھما دیا جائے۔شام کے وقت گھوڑوں اور انڈوں کی بچی ہوئی تعداد سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ افواہ صحیح ہے یا غلط اور دراصل بیشتر گھروں میں کس کے حکم کا ڈنکا بج رہا ہے۔

چنانچہ دوسرے دن ایسا ہی کیا گیا اور شام تک چوک سے گذرنے والے لوگوں میں گھوڑے اور انڈے بانٹے جاتے رہے۔رات ہونے کو آئی تو ایک درباری نے جھک کر وزیراعظم سے عرض کی: ''حضور! اب تو آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں بچا ہے۔گستاخی معاف! اب آپ فرمائیے کہ آپ کی محل سرا میں کس کی حکومت چلتی ہے؟''

وزیراعظم نے غصہ سے ڈپٹ کر کہا: ''بیوقوف کہیں کا! یہ کیسا سوال ہے؟ ارے ہم وزیراعظم ہیں وزیراعظم! کوئی ایرے غیرے، نتھو خیرے تھوڑی ہیں! ہمارے گھر میں ہمارا حکم چلتا ہے! اور بھلا کس کا چلے گا؟''

درباری جھک کر کورنش بجالائے اور وزیراعظم کو ایک عدد عربی نسل کا نہایت نفیس گھوڑا پیش کیا گیا۔ابھی وہ لوگ سامان سمیٹ کر چوکسے گھر جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ وزیراعظم واپس چوک تشریف لائے۔

درباریوں نے بڑھ کر سوال کیا: ''غریب پرور! اب کیا حکم ہے؟ کیسے تشریف آوری ہوئی؟''

وزیراعظم نے کہا: ''بھئی! ہماری بیگم کہتی ہیں کہ یہ کیا کالے رنگ کا گھوڑا لے آئے؟ جائیں سفید رنگ کا گھوڑا لے کر آئیں!''

درباریوں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی: ''حضور، معاف کیجئے گا! مناسب یہ ہے کہ بندہ پرور اب اس گھوڑے کی بجائے یہ انڈا ہی گھر لیتے جائیں!''

رام دئیؔ چھوئی کھدان تلیا میں ڈوب کر مر گئی! یہ خبر پورے محلّہ میں آگ کی طرح پھیل گئی۔''ہے ہے! رام دئیؔ مر گئی؟ کیسے؟ کیا ہوا؟۔۔ہوتا کیا بہو! چھوئی کھدان کسی کام سے گئی تھی۔پیر پھسل گیا اور پھر وہ سنبھل نہیں سکی۔ارے، رام، رام! اب نندیؔ کا کی ہوگا؟''

رام دئیؔ تھی تو نائن مگر محلّہ کے ہر گھر میں اس کا آنا جانا تھا اگر کسی کام سے نہ جاتی تو بہانے سے چلی جاتی اور دنیا بھر کی افواہیں، تیری میری خبریں، گھر کی بہو بیٹیوں کی کچھ سچی اور کچھ من گھڑت کہانیاں، لونڈوں لپاڑوں کی آوارگی کے قصے اور اسی طرح کی خرافات اپنی طرف سے مرچ مصالحہ لگا کر بڑی رازداری کے انداز میں سناتی:

''بہو جی! بس تم سے کہہ رہی ہوں۔کسی اور سے مت کہیو۔اجت کا ماملہ ہے!'' وہ تاکید کرتی اور پھر کسی اور گھر جا کر وہی قصہ اسی رازداری سے سناتی۔اس صلہ میں اکثر گھروں سے اس کو کچھ کھانا پینا یا روپیہ دھیلی مل جاتا تھا۔

اور آج رام دؔئی مر گئی تھی۔ سڑک کی دوسری طرف بنی جھونپڑی سے اس کی ماں کے بین کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ذرا دور ہی محلّہ کی کئی عورتوں کے ساتھ کلیاؔنی بھی ساری کے پلّو کا کانا گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی۔ مسیؔتا جھونپڑی کی چوکھٹ پر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیڑی دبی ہوئی تھی جس کو وہ سلگانا بھول گیا تھا اور قریب ہی اس کی تین سال کی لڑکی نندؔی کھڑی کچھ نہ سمجھتے ہوئے منھ بسور بسور کر درد بھری آواز میں ''اماں! اماں!'' پکار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اس کی میلی کچیلی قمیص میں جذب ہو رہے تھے۔ برادری کی عورتیں اور آدمی رام دؔئی کا آخری سنسکار کرنے کی فکر میں ادھر سے اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بیکس نندؔی کی طرف کون توجہ دیتا!

شام ہوتے ہوتے برادری کے لوگ رام دؔئی کی ارتھی اٹھائے تیز تیز قدم شمشان گھاٹ کی طرف چل دئے:

رام نام ست ہے، ست بولو مکت ہے!

گوپال نام ست ہے، ست بولو مکت ہے!

پنڈت دگمبر پرساؔد اس شام پنالالؔ پنواڑی کی دوکان پر کچھ زیادہ ہی دیر تک بیٹھے رہے۔ ایک تو وہ شطرنج کی بازی مکٹ بہاریؔ سے بری طرح ہار گئے تھے، جس کا بدلہ ''ایک اور بازی'' سے لینا ضروری تھا۔ دوسرے بابو دین محؔمد سب سے رام دؔئی کے گھر والوں کے لئے کچھ پیسے جمع کر رہے تھے، اس کی جھک جھک میں بھی کچھ وقت لگ گیا تھا۔ گھر لوٹے تو اچھا خاصہ اندھیرا ہو چلا تھا۔ وہ ذرا ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوئے۔ معلوم نہیں کلیاؔنی کا موڈ کیسا ہو! آنگن میں لگے نل سے انہوں نے ہاتھ منھ دھویا اور ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر اپنی آمد کا اعلان بھی کیا۔ گھر میں خلاف معمول آج خاموشی سی تھی۔ پوجا پاٹھ کے کمرہ میں وشنو دیؔوتا کی مورتی کے سامنے پیتل کا دیا جگمگا رہا تھا اور رسوئی سے کچھ آہٹ سی آ رہی تھی۔ وہ رسوئی میں داخل ہوئے تو کلیاؔنی چولہے کے سامنے سر جھکائے بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ پنڈت جؔی کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تو دگمبر پرساؔد اس کی آنکھوں کے بے پناہ درد کو دیکھ کر کانپ کانپ گئے۔ مگر پھر ان کی نگاہیں کلیاؔنی کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے رسوئی کے دوسرے کونے میں گئیں تو ٹھٹھک کر رہ گئیں!

کلیاؔنی کی رسوئی کے دوسرے کونے میں رام دؔئی کی بیٹی نندؔی ایک پیالہ میں دودھ میں بھیگی روٹی سپڑ سپڑ کر کھا رہی تھی!

اور چراغ بجھ گئے!

کیفے ٹیریا کی لائن میں کھڑی وہ لڑکی معلوم نہیں پرویؔز کو اتنی اچھی کیوں لگ رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگوں والی شلوار اور جمپر میں ملبوس، شانوں پر سرمئی اوورکوٹ ڈالے اور گلابی دوپٹہ آدھے سر سے اوڑھے وہ دھیرے دھیرے کھانے کی لائن میں آگے بڑھ رہی تھی۔ کہیں کہیں وہ رک کر اپنی پسند کی کوئی چیز اٹھا کر اپنی ٹرے میں رکھ لیتی اور پھر کاؤنٹر کی جانب بڑھ جاتی جہاں ایک نوعمر امریکن لڑکی لوگوں سے کھانے کے پیسے وصول کر رہی تھی۔ پرویؔز اس کیفے ٹیریا میں اکثر لنچ کھانے آجایا کرتا تھا مگر آج سے پہلے اس نے اس لڑکی کو یہاں نہیں دیکھا تھا۔ اور آج دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا! اس کو خود اس بات پر حیرت تھی۔ امریکہ میں خوبصورت لڑکیوں کا کال نہیں تھا۔ پھر یہ لڑکی جو صورت اور لباس دونوں سے ہندوستان یا پاکستان کی معلوم ہوتی تھی، ایسی خوبصورت بھی تو نہیں تھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو نہ صرف رنگت ہی سانولی تھی بلکہ اس کا نقشہ بھی معمولی سا تھا۔ ناک تو یقیناً'' ضرورت سے زیادہ ہی لمبی تھی۔ پھر وہ کون سی بات تھی جو پرویؔز کو مجبور کر رہی تھی کہ اس لڑکی کو بار بار دیکھے؟ ابھی وہ اس گتھی سے دوچار ہی تھا کہ وہ لڑکی پیسے دے کر کونہ میں ایک میز پر ٹرے لے کر بیٹھ گئی۔ کاؤنٹر پر کھانے کے پیسے دے کر پرویؔز نہ جانے کیا سوچ کر اسی کونے کی میز پر جا پہنچا۔ وہ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھی۔ پرویؔز کی آواز پر وہ چونک پڑی:

''معاف کیجئے گا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی اسی میز پر بیٹھ جاؤں؟''

اس لڑکی نے بڑی بڑی ہراساں آنکھوں سے اس کو دیکھا اور قدرے کانپتی ہوئی آواز میں بولی: ''جی! جی! بیٹھ جایئے۔'' وہ اپنی کرسی پر ایسے سمٹ کر بیٹھ گئی جیسے یہ اجنبی شخص بھی اسی پر بیٹھنے والا ہو۔

پرویؔز کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا: ''میں اپنی اس بے تکلفی کی معافی چاہتا ہوں۔ امریکہ میں اپنے ہم وطن کو دیکھ کر خیال ہوا کہ بات چیت سے دل بہل جائے گا۔ پھر آپ بھی تو تنہا بیٹھی ہوئی ہیں!''

اب وہ کچھ سنبھل گئی تھی۔ ذرا سا ٹھیر کر اس نے کہا: ''جی ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اردو بولتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

پرویؔز کے چہرہ پر اس کے بھولے سوال پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی جو وہ بہ مشکل گوشت کے لقمہ میں چھپا گیا۔ وہ بھی شاید اپنی حماقت پر جھینپ سے گئی تھی اور اب جھک کر کھانے میں مصروف تھی۔ پرویؔز اب شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔ مسکرا کر بولا: ''جی! دراصل امریکن لڑکیاں شلوار قمیص ذرا کم ہی پہنتی ہیں نا!'' ابھی شاید وہ کچھ اور کہتا لیکن لڑکی کا شرم سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر رک گیا۔

اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''خیر! چھوڑئے ان باتوں کو! میرا نام پرویؔز ہے اور میں علی گڑھؔ، ہندوستان سے ہوں۔''

''جی! میرا نام شمیؔم ہے اور میں کراچؔی، پاکستان سے ہوں'' اس نے مدھم لہجہ میں جواب دیا۔

''اچھا، آپ کراچؔی سے ہیں؟ کہاں رہتی ہیں کراچؔی میں آپ؟''

''آپ کبھی کراچؔی گئے ہیں؟'' شمیؔم کے لہجہ میں اب شوخی جھلک رہی تھی۔

''جی، میں تو کبھی پاکستاؔن ہی نہیں گیا!'' پرویؔز اپنی حماقت پر جھینپ کر بولا۔

''تو پھر اگر میں کراچؔی کے کسی محلّہ کا نام لے بھی لوں تو آپ کے کیا پلے پڑے گا؟'' وہ مسکرا رہی تھی اور پرویؔز کو جھینپ کے باوجود بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ہنس دیا۔

''لاحول ولاقوۃ! میں بھی کس قدر احمق ہوں! چلئے معاملہ برابر سرابر ہو گیا! اب کوئی اور بات کیجئے۔ آپ کب امریکہ آئیں؟''

شمیؔم نے بالوں کی ایک آوارہ لٹ کو سنوارتے ہوئے جواب دیا: ''بس، یہی کوئی ایک ماہ ہوا ہے۔ وُسٹر (Worcestor) میں جو گونگوں بہروں کا اسکول ہے نا،

اسی میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔''

پرویزؔ کا منھ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ امریکہؔ میں کئی سال سے مقیم تھا اور اس نے انجینئرنگ، میڈیکل، بزنس اور جانے کس کس شعبہ میں لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے امریکہؔ آتے دیکھا تھا۔ مگر کوئی شخص (اور وہ بھی ایک لڑکی!) گونگوں بہروں کے اسکول میں پڑھنے آئے گا، یہ تو اس کے خواب وخیال میں بھی کبھی نہیں گذرا تھا۔ پھر دیر تک شمیم اس کو بتاتی رہی:

''جی دیکھئے! جو لوگ گونگے کہلاتے ہیں وہ دراصل بیشتر بہرے ہوتے ہیں! چونکہ کان میں کوئی آواز پڑتی ہی نہیں ہے اس لئے وہ بول بھی نہیں سکتے ہیں۔ بچہ سن کر اور نقل کر کے ہی بولنا سیکھتا ہے۔ جب سنے گا نہیں تو بولے گا کیسے؟ یہاں گونگوں کو بولنا سکھایا جاتا ہے۔ میں یہی فن حاصل کر رہی ہوں۔ پھر میں ہیرنگ ایڈ (Hearing Aid) کی مرمت کا کام بھی سیکھوں گی۔ ہمارے ملک میں اول تو ہیرنگ ایڈ خرید ہی کتنے لوگ سکتے ہیں۔ پھر اگر وہ خراب ہو جائے تو اس کی مرمت کرنے والا ہی کوئی نہیں ہے۔ میں سیکھ کر جاؤں گی تو اپنے اسکول میں دوسروں کو سکھاؤں گی، انشاءاللہ!''

پرویزؔ حیرت اور شوق سے اس سانولی سلونی لڑکی کی کہانی سن رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ اس کے دل میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح بولتی رہے اور وہ اسی طرح سنتا رہے۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور جب میز سے اٹھے تو پھر مل بیٹھنے کا شوق دونوں کے دلوں میں جاگ اٹھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بتائے بغیر دوسرے دن کا انتظار ابھی سے کر رہے تھے!

شمیمؔ کے ماں باپ اس کے بچپن میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ گھر میں اب سوائے شمیمؔ اور اس کے بڑے بھائی اخترؔ کے اور کوئی نہیں تھا۔ اخترؔ ان دنوں کالج میں تھا۔ برے وقت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے، پھر دنیاوی عزیزوں کا کیا ذکر؟ چاروں طرف ایک بھری دنیا تھی مگر ان دو جانوں کی دنیا اک دم سونی تھی۔ جس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھتے وہ نظریں چرا لیتا۔ جس گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوں وہاں کالج اور تعلیم کا کیا ذکر! اخترؔ نے بھی کالج چھوڑ کر ایک جگہ معمولی کلرکی کر لی۔ ایسے وقت میں ایک رحم دل پڑوسی نے اتنا ساتھ دیا کہ اسکول سے واپسی پر شمیمؔ اس کے گھر آ کر بیٹھ جاتی۔ شام کو اخترؔ واپس آتا تو اسے گھر لے جاتا، الٹی سیدھی دال روٹی پکا کر اپنا اور شمیمؔ کا پیٹ بھرتا، رات کو لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کو پڑھاتا اور پھر اپنے ہاتھوں سے چادر اڑھا کر اسے سلا دیتا۔ ماں باپ دونوں کی شفقت اور محبت اس کے دل میں سمٹ آئی تھی۔ شمیم اداس ہوتی تو وہ تڑپ اٹھتا، وہ مسکراتی تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ دفتر سے لوٹتا تو کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز بہن کے لئے لے کر آتا۔ کبھی شمیمؔ کچھ کہتی بھی کہ ''بھائی جان! روز نہ لایا کیجئے۔ پیسے کسی اور کام آئیں گے۔'' تو وہ ہنس دیتا: ''پگلی کہیں کی! پیسے تجھ سے زیادہ ہیں کیا؟ تو غم نہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو بھی گیا۔ اخترؔ نے راتوں کی محنت سے پرائیویٹ بی اے کر لیا اور اسے ایک اچھی نوکری بھی مل گئی۔ ذرا آسودگی ہوئی تو رشتہ داروں نے بھی چولا بدلنا شروع کیا۔ راہ چلتے ٹوک دیتے اور کچھ تو اس کے گھر تک آ چکے تھے: ''ارے میاں اخترؔ! کبھی بھولے سے ہماری طرف بھی آ جایا کرو! اب ایسا بھی کیا ہے؟ ابھی ہم زندہ ہیں بھائی، خون خشک نہیں ہوا ہے!''

اخترؔ ''ہوں، ہاں'' کرتا اور مسکرا کر ٹال دیتا۔ اسے تو بس ایک ہی دھن تھی کہ شمیمؔ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی بھی اس کی بہن کو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑے۔ جس دن شمیمؔ نے ہائی اسکول پاس کیا، اس دن اخترؔ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ بازار سے برفی لایا، اپنے ہاتھوں سے چھوٹی بہن کو کھلائی اور اس کو سینہ سے لگا کر ماں باپ کو یاد کر کے خوب ہی تو رویا۔ شمیمؔ نے اس کو اس حال میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی خوب روئی۔ بھائی کی محبت نے جو کچھ بھلا دیا تھا، آج پھر یاد آ رہا تھا۔

اخترؔ کو اب فکر تھی کہ شمیمؔ کالج جائے۔ ایک دن اس نے پوچھا: ''اب میری شمو کالج جائے گی! کیا پڑھے گی کالج میں؟''

شمیمؔ اس موضوع پر بہت سوچ چکی تھی۔ اس نے اپنی ذرا سی عمر میں اس دنیا کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ اخترؔ شاید اس کے خیالات سے اتفاق نہیں کر سکے گا۔ پھر بھی ہمت کر کے اس نے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ ''جی بھائی جان! وہ جو صدر میں جو گونگوں بہروں کا اسکول ہے نا، میں وہاں پڑھنا چاہتی ہوں۔ پھر وہیں نوکری کر لوں گی اور بچوں کی خدمت کروں گی۔''

اخترؔ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔

''گونگوں بہروں کا اسکول؟ ارے کیا سنک گئی ہے شمو؟ بھلا اس میں کیا رکھا ہے؟ چھوٹی موٹی نوکری مل گئی تو اس سے کیا ہوگا؟ میڈیکل ویڈیکل کر لے، اچھا؟''

مگر شمیمؔ اپنی ضد پر اڑی رہی اور اخترؔ کو اپنی پگلی شمّو کے سامنے ہار ماننی ہی پڑی!

وقت گذرتے کیا دیر لگتی ہے۔ شمیمؔ نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور گونگوں بہروں کے اسکول میں پڑھانے کی ملازمت بھی مل گئی۔ ادھر اخترؔ جیسے اسے دیکھ کر ہی جی رہا تھا۔ جس دن شمیمؔ نے اپنی پہلی تنخواہ اخترؔ کے ہاتھ پر لا کر رکھی وہ بے اختیار رو پڑا اور دیر تک شمّو کو سینہ سے لگائے روتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بوجھ آج کاندھوں سے اتر گیا تھا جو ماں باپ کی موت نے اس کو سونپا تھا۔ آج شمیمؔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی اور اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

لوگ اب اخترؔ سے شادی پر زور دینے لگے تھے۔ اور بھلا کیوں نہ دیتے! ایسے کماؤ نوجوان کہاں ملتے ہیں؟ پھر بھلا اخترؔ اپنے رشتہ داروں کی ان محبتوں کا بوجھ کیسے نہ اتارتا جو اب اچانک اپنی دیرینہ عزیز داریاں یاد دلانے اور اپنی اپنی بیٹیاں اس کی زوجیت میں دینے کے لئے صبح و شام بے چین رہا کرتے تھے! ادھر شمیمؔ بھی اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی: ''اللہ، بھائی جان! میں گھر کی تنہائی سے پریشان ہو گئی ہوں۔ لے آیئے نا اچھی سی بھابی! پلیز بھائی جان!''

اور ایک بار پھر وہ اس لڑکی سے ہار مان کر چاند سی دلہن کو گھر لے ہی آیا۔ قسمت سے بھابی بھی ایسی ملی کہ شمیمؔ اس سے گھل مل کر ایک جان دو قالب ہو کر رہ گئی۔ ہنسنا، بولنا، کھانا، پینا دونوں ساتھ ہی کرتیں۔ گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ سال بھر گذرا تھا کہ اس گہوارے میں دو جڑواں بچیوں نے پینگ لینی شروع کر دیں! شمیمؔ نے بھتیجیوں کو ایسے سینہ سے لگایا جیسے ان کے بعد اب کوئی حسرت نہیں رہ گئی تھی۔ اخترؔ کا گھر محبت اور خوشی کی جنت بن کر رہ گیا تھا۔

اس شام جب شمیمؔ اور رخشندہؔ بھابی، اخترؔ کی مسلی کچلی خون سے شرابور میت گھر لے کر آئیں تو وہ جنت خاک میں مل چکی تھی۔ روتے روتے آنسوؤں کا سیلاب خشک ہو چلا تھا۔ ستے ہوئے چہرے اور ویران آنکھیں رہ رہ کر آسمان کی جانب اٹھتیں اور پھر غم کے بوجھ سے زمیں دوز ہو جاتیں۔ دفتر سے واپسی پر بس سے ٹکرا کر اخترؔ اس دنیا سے کیا گیا تھا اپنے ساتھ چار اور جانوں کی امیدیں، آرزوئیں اور زندگیاں بھی لے گیا تھا۔ نجمہؔ اور سلمہؔ اس حادثہ اور اس کی قیامت سے بے خبر کھلونوں میں مصروف تھیں اور شمیمؔ اور رخشندہؔ بھابی قسمت کے ہاتھوں اپنی زندگیاں کھلونا بنتے دیکھ کر حیران و پریشان تھیں۔ مگر شمیمؔ نے قسمت سے ہار ماننا کب سیکھا تھا جو وہ منھ لپیٹ کر دروازوں کے پیچھے بند ہو جاتی۔ اسے تو رخشندہؔ بھابی اور نجمہؔ اور سلمہؔ کے ان خوابوں کی تعبیر بننا تھا جو ان کی معصوم، مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ابھی بیدار بھی نہیں ہوئے تھے۔ اسے تو اس ظالم زندگی کو شکست دینی تھی جس نے ہر موڑ پر اسے فریب دینے کی ٹھان رکھی تھی۔

وہ ہزار مشکلوں کے بعد وظیفہ حاصل کر کے امریکہ آئی تھی مگر اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اسی گھر میں رہ گیا تھا جس کی دہلیز سے رخشندہؔ بھابی نے سسکیوں کے ساتھ رخصت کیا تھا اور جس کے آنگن میں کھیلتی ہوئی نجمہؔ اور سلمہؔ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر ''تا تا!'' کہا تھا۔

کیفے ٹیریا میں چند ملاقاتوں میں وہ دونوں کتنے قریب آ گئے تھے! پرویزؔ نے جب سے شمیمؔ کی کہانی سنی تھی اس کی حیرت اور محبت اس سانولی سلونی معصوم لڑکی کے لئے اور بڑھ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خالی وقت کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گذارے۔ بوسٹن (Boston) کے باغات، میوزیم اور تھیٹر انہیں روز ہی دعوت نظارہ دیتے تھے اور وہ اکثر اس دعوت کو قبول بھی کر لیتے تھے۔ گپ شپ، ہنسی مذاق اور سیر تفریح میں دن جیسے جیسے گذر رہے تھے ان کے دلوں کا رشتہ اور مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ لیکن اس رشتہ کا اعتراف ابھی تک زبانوں پر آتے ہوئے شرماتا تھا۔ بوسٹن کامنز (Boston Common) کی شامیں اس ہچکچاہٹ کو کم کرنے میں ناکام رہی تھیں اور دلوں کا افسانہ چوری چھپی نگاہوں سے ہی ادا ہو رہا تھا۔

ایسی ہی ایک شام دونوں پارک کی بینچ پر بیٹھے چارلس ندی (Charles River) میں ڈوبتے سورج کی جگمگاتی سرخی میں نہائے بیٹھے تھے۔ شمیمؔ خاموش اپنے خیالات میں گم تھی کہ پرویزؔ کی آواز نے اس کو چونکا دیا: ''شمیمؔ! اگر میں تم کو تمہارے گھر کے نام سے پکاروں تو برا تو نہیں مانو گی؟ تم بھی مجھے میرے گھریلو نام سے پکار لیا کرو!''

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ جہاں اور لوگ شمّو کہتے ہیں آپ بھی کہہ لیا کیجئے۔'' وہ سر جھکا کر دھیمی آواز سے بولی۔ اس کا دل یہی سوچ کر بلّیوں اچھل رہا تھا کہ پرویزؔ اسے شمّو کہہ کر پکارے گا۔

پھر وہ کچھ سوچ کر بولی: ''آپ کا گھر کا نام کیا ہے؟''

پرویزؔ بے اختیار مسکرا پڑا اور شرارت سے شمیمؔ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: ''پیارے میاں! کیوں، بلاؤ گی مجھ کو اس نام سے؟''

شمیمؔ اس بری طرح جھینپ کر دوسری جانب مڑ گئی کہ پرویزؔ کا قہقہہ نکل پڑا۔ وہ ہنستا ہنستا دُہرا ہو گیا۔ ادھر شمیمؔ تمتماتا ہوا چہرہ اور کانپتے ہوئے ہونٹ لئے اپنی اس مسکراہٹ کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے چہرہ کو لالہ زار بنانے کے لئے بیقرار تھی۔

پرویزؔ نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا: ''بولو شمیمؔ! جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

''اللہ! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھ کو یہ اونٹ پٹانگ مذاق اچھا نہیں لگتا ہے۔ ہاں نہیں تو!'' اس نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ لیکن آنکھیں تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں اور پرویزؔ یہ زبان خوب سمجھتا تھا۔

اس نے آج پہلی بار ہمت کر کے کانپتے ہاتھوں سے شمیمؔ کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کی انگلیوں میں پھنسی ہوئی شمیمؔ کی انگلیاں پسینہ سے شرابور کس بری طرح کانپ رہی تھیں۔ اسے تو بس یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا یہ لمحہ اپنی جگہ ٹھیر گیا ہو۔ اس شام وہ جدا ہوئے تو اپنے ساتھ ایک دوسرے کا وجود بھی لیتے گئے۔ اب کوئی اکیلا نہیں تھا۔

پیاری بھابی! سلام

بوسٹن: ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ء

امید ہے آپ اور سب لوگ اچھے ہوں گے۔ میں بھی ٹھیک ہوں۔ پڑھائی ختم ہونے والی ہے اور میں واپسی کے دن گن رہی ہوں۔ ہائے وہ کیسا دن ہوگا جب میں واپس گھر پہنچ جاؤں گی اور نجمہؔ اور سلمہؔ کو پھر سینہ سے لگا کر پیار کر سکوں گی۔ انہیں بھلا پھوپی امّی کیا یاد ہوں گی! مگر میرے تو دن رات آپ لوگوں کی یاد میں ہی کٹتے ہیں۔ اور دو ڈھائی ماہ رہ گئے ہیں۔ جنوری میں انشاءاللہ فارغ ہو جاؤں گی۔ آپ ایرپورٹ آئیں گی نا؟ دونوں گڑیوں کو بھی ضرور لے کر آیئے گا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

کالج سے میری تنخواہ آپ کو مل ہی رہی ہوگی۔ کوئی تکلیف نہ اٹھایئے گا۔ جیسی ضرورت ہو کہیں سے انتظام کر کے خرچ کر لیجئے گا۔ میں واپس آ کر سب دیکھ لوں گی۔

یہاں موسم سرد ہو چلا ہے۔ برفباری کا زمانہ جو ٹھیرا! وقت اچھا کٹ رہا ہے۔ اپنا خیال رکھئے گا اور دونوں گڑیوں کو میری طرف سے خوب سا پیار کر دیجئے گا۔

اچھا میری پیاری بھابی! خدا حافظ۔ جلد ہی پھر لکھوں گی۔

آپ کی پیاری: شمیمؔ

فون کی گھنٹی بجی تو شمیمؔ نے بھاگ کر اٹھا لیا۔ اس کو معلوم تھا کہ کس کا فون ہے! بوسٹنؔ میں اسے فون کرنے والا اور تھا بھی کون؟ اس نے رسماً ''پوچھا: ''ہیلو؟''

''جی میں پیارے میاںؔ بول رہا ہوں۔ کیا ہو رہا ہے؟'' دوسری طرف سے آواز آئی جس میں شوخ مسکراہٹ کی جھلک تھی۔

''پھر وہی اناپ شناپ کہنے لگے آپ! بس ٹی وی دیکھ رہی تھی۔'' اس نے مصنوعی غصہ سے جواب دیا، جس کا دوسری طرف کوئی اثر نہیں ہوا۔

''میں آ رہا ہوں شمیمؔ! کیمبرج (Cambridge) چلیں گے۔ کہیں کھانا وانا کھائیں گے اور پھر ندی کنارے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔ تم آدھے گھنٹے میں تیار ملنا، اچھا؟'' پرویزؔ کی آواز میں پیار جھلک رہا تھا۔

چارلس ندی (Charles River) کے کنارے بینچ پر بیٹھ کے پانی میں شہر کی روشنی کی جگمگاہٹ دیکھنے کا خبط نوجوان امریکن جوڑوں کو عام سا تھا۔ آج بھی جا بجا لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ موسم اور دریا کے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور کچھ ایک دوسرے سے۔ پرویزؔ اور شمیمؔ ایک کونہ میں بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ پرویزؔ نے آہستہ سے شمیمؔ کا ہاتھ تھام لیا اور شرم سے تمتما کر شمیمؔ کا سر جھک گیا۔

''شمیمؔ! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ ادھر دیکھو میری طرف!'' پرویزؔ کی آواز میں لرزش تھی۔

''جی! کیا کہنا چاہتے ہیں آپ، کہیئے!'' وہ اسی طرح سر جھکائے جھکائے بولی۔

''تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہارے دل میں میری کتنی جگہ ہے۔ منہ سے نہیں کہتی ہو تو کیا ہوا!'' پرویزؔ نے رک کر تھوک نگلا۔ ''شمیمؔ! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں! بولو تم کیا کہتی ہو؟''

شمیمؔ کے منہ سے اچانک ہلکی سی چیخ نما سسکاری سی نکل گئی جیسے اس کو بجلی کا جھٹکا سا لگ گیا ہو۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور پرویزؔ کی انگلیوں میں دبا ہوا اس کا ہاتھ اکڑ کر پتھر ہو گیا۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر کر اس کے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔

پرویزؔ گھبرا گیا: ''ارے ارے شمیمؔ! کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟ میری بات بری لگ گئی کیا؟ میں تو سوچتا تھا کہ تم سن کر بہت خوش ہوگی۔ مجھے معاف کر دو۔ اب ایسی بات کبھی نہیں کروں گا۔'' اس کے لہجہ سے بے حد مایوسی ٹپک رہی تھی۔

شمیمؔ برابر ہچکیاں لے لے کر روئے چلی جا رہی تھی۔ ''اللہ! آپ ایسا نہ سوچئے! میں سب سمجھتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھ سے ایسی بات نہ کیجئے!''

''مگر شمؔو! آخر کیوں؟ اگر تم میرے دل کا حال جانتی ہو تو پھر یہ آنسو کیسے ہیں؟ کچھ تو بتاؤ کہ کیا بات ہے؟''

''کیا کہوں میں؟ اللہ، آپ مجھ کو معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی بات نہیں مان سکتی ہوں!'' شمیمؔ نے سسکیوں کے درمیان گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم شمؔو؟ آخر تم کو کیا اعتراض ہے؟ کیا میں تمہارے لائق نہیں ہوں؟'' پرویؔز کے لب و لہجہ کے کرب میں اب غم و غصہ ڈھلنے لگا تھا۔

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں آخر؟'' وہ بے اختیار رو دی۔ ''اللہ! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میری شادی ہو چکی ہے!''

''ایں! کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ کب ہوئی؟ کس سے ہوئی؟ تم نے اس سے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' پرویؔز غم و حیرت سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

شمیمؔ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بولی: ''جی! میں کیا بتاتی؟ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میری شادی نجمؔہ اور سلمؔہ سے ہو چکی ہے!''

اس نے ہچکی لے کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور سر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

راکھ

پیلی بھیتؔ کے پی ڈبلو ڈی (Public Works Deapartment) ڈاک بنگلہ میں یہ چنڈال چوکڑی ایک ہفتہ سے ٹھیری ہوئی تھی۔ آج اتوار کا دن تھا، چنانچہ دفتر جانے یا سڑک پر ٹریننگ سے فراغت تھی۔ صبح اطمینان سے اٹھ کر اور محمد علی چپراسی کے بنائے ہوئے ناشتہ سے نمٹ کر چاروں تاش کی بازی پر جم گئے تھے۔ محمد علی کو حکم تھا کہ چائے کا پانی مستقل تیار رہے اور ایک آواز پر چائے حاضر کی جائے۔ اتوار کو محمد علی عموماً ''بیوی بچوں سے ملنے بریلی چلا جایا کرتا تھا۔ آج شاید جیب نے اجازت نہیں دی تھی اور وہ پیلی بھیتؔ ہی ٹھیر گیا تھا۔ اس کی تھکی تھکی چال اور اداس اداس آنکھیں اس کے دل کا حال بیان کر رہی تھیں، جس کو سننے اور سمجھنے کی فرصت یا ضرورت ہم چاروں زیر تربیت انجینئروں کو نہیں تھی کیونکہ پی ڈبلو ڈی (P, W. D.) کا مسلمہ اصول اسی طرح کا ذہن چاہتا تھا۔ محمد علی سرکار کی جانب سے ہمارے ساتھ ٹانک رکھا تھا۔ جہاں ہم جاتے وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتا اور ہماری جملہ ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ عام طور سے ہم بریلی میں ہی رہتے تھے لیکن کبھی کبھی قریبی قصبوں میں بھی کام سے جانا پڑتا تھا۔

پیلی بھیتؔ پہنچ کر ہم لوگوں کو فوراً ''معلوم ہو گیا تھا کہ عرف عام میں اس نامراد شہر کو ''پیلا بھوتؔ'' کیوں کہا جاتا تھا۔ ویران اور ہر طرح سے اجڑا ہوا یہ شہر بریلی سے چند میل کے فاصلہ پر ہی تھا لیکن پیسنجر ٹرین کی کمر توڑ سیٹ پر بیٹھ کر یہ مختصر سفر گھنٹوں میں طے ہوا کرتا تھا۔ ڈاک بنگلہ شہر سے باہر ایک سنسان علاقہ میں بنا ہوا تھا۔ تقریباً ''ہر جگہ ہندوستان کے سابقہ مالک انگریزوں نے سوچ سمجھ کر ڈاک بنگلے بستیوں سے دور بنوائے تھے تاکہ وہاں ٹھیرنے والے گورے صاحبوں کے آرام اور عیاشی میں کم سے کم خلل پڑے اور دیسی کالے لوگوں سے بھی فاصلہ قائم رہے۔ ڈاک بنگلہ سے ایک ٹوٹی پھوٹی مردم بیزار سی سڑک شہر جاتی تھی۔ پیلی بھیتؔ، (معاف کیجئے گا! میرا مطلب ہے پیلا بھوتؔ) میں اس زمانہ میں صرف ایک سنیما گھر تھا اور ایک ہی قابل ذکر سڑک جس پر وہاں کا خاص بازار لگا کرتا تھا۔ اس کو کسی ستم ظریف نے بڑا بازارؔ کا نام دے رکھا تھا۔ دن میں اس بازار میں عجیب سی دھما چوکڑی مچی رہا کرتی تھی۔ مختصر سی سڑک پر گھوڑا گاڑی، رکشہ، بس اور بیل گاڑی کے علاوہ شہر کی نصف انسانی آبادی اپنے جلو میں گائے بکری اور اونٹ لئے ادھر سے ادھر بظاہر بے مقصد سی دوڑ میں مصروف نظر آتی تھی۔ دو ایک مرتبہ ہم لوگ بھی تفریحاً ''بڑے بازار گئے تھے اور چند منٹ کی ''تفریح'' کے بعد ہی الٹے پاؤں واپس آ گئے تھے۔ ایک شام ہمت کر کے شہر کے اکلوتے سنیما گھر میں فلم لیلی مجنوںؔ دیکھنے بھی گئے تھے مگر جیسے ہی لیلیؔ کے پہلے ڈانس پر اٹھنی چھاپ سیٹوں سے اسی چھاپ کے فقروں اور پیسوں کی بوچھار پردہ کی جانب شروع ہوئی، ہم چاروں نے ہال سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ اب لے دے کر فرصت کا مشغلہ تاش کی بازی ہی رہ گئی تھی۔

ہم چاروں نے علی گڑھؔ یونیورسٹی سے گذشتہ سال ہی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی اور اسے ہماری خوش قسمتی کہئے یا پی ڈبلو ڈی (P. W. D.) کی ناعاقبت اندیشی کہ چاروں کو ٹریننگ کے لئے بریلی میں تعینات کر دیا گیا تھا جہاں سے ہماری بدتقدیری نے ہم کو پیلا بھوتؔ چند ہفتوں کے لئے پہنچا دیا تھا۔ اس کا ملال مختار بیڑیؔ کو سب سے زیادہ تھا اور اس کا ٹکسالی اظہار وہ صبح و شام مرصع گالیوں سے کرتا رہتا تھا۔ پکے رنگ، چیچک زدہ چہرہ اور منھ میں ہر وقت دبی ہوئی بیڑی کے ساتھ مختارؔ کی گالیاں ایسی زیادہ بری بھی نہیں معلوم ہوتی تھیں گویا ایسے حلیہ کے شخص کو بدزبانی کا پیدائشی اختیار تھا۔ اس کا پورا نام مختار احمدؔ تھا لیکن چونکہ مستقل بیڑی پیتا رہتا تھا اس لئے ہر شخص اسے مختار بیڑیؔ کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ ہوٹل بازی، میرس روڈ پر لڑکیوں کے پیچھے آوارہ گردی اور سنیما کا عاشق تھا۔ یہ راز کسی پر کبھی نہیں کھلا کہ آخر وہ انجینئرنگ کالج تک پہنچا کیسے، اور پھر لشتم پشتم ہی سہی امتحان میں پاس کیسے ہو گیا؟ یاروں کا خیال تھا کہ وہ نقل کرتا ہے مگر کبھی پکڑا نہیں گیا، چنانچہ یہ افواہ بھی صرف افواہ ہی رہی۔ پیلا بھوتؔ پہنچ کر معلوم ہوا کہ کم بخت تاش کا ماہر بھی ہے۔ ہمیشہ میز سے مال جیت کر ہی اٹھتا۔ سید کاظم حسینؔ کا خیال تھا کہ مختار بیڑیؔ منجھا ہوا جواری ہے اور تاش میں ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہے۔ اس الزام پر مختار بیڑیؔ ہمیشہ مسکرا کر آنکھ مارتا اور کہتا: ''سید صاحب! کھسیانی بلی کھمبا نوچے! جانے سالے کس چڑی مار سے تاش سیکھ کر آئے ہو۔ بیٹا! پہلے یہ فن حاصل کرو پھر جھک مارنا، ہاں!'' اس پر میز کی دوسری طرف بیٹھا اخلاص احمدؔ قراءت سے لاحول پڑھتا اور بڑے انہماک سے میز پوش گھورنے لگتا تھا۔

اخلاص احمدؔ علی گڑھ کا رہنے والا تھا۔ کھلتا ہوا رنگ، گول مٹول بدن، سر پر بے تحاشہ سیاہ بال جو ہمیشہ تیل سے چمکتے رہتے تھے۔ بڑا شرمیلا تھا چنانچہ کالج میں ہمیشہ ساتھیوں کے لئے تماشہ بنا رہتا تھا۔ یار لوگوں نے اس کی فرضی آوارہ گردی اور گرلس کالج کی مختلف لڑکیوں سے اس کے عاشقانہ تعلقات کے من گھڑت قصے پھیلا رکھے تھے۔ اخلاص احمدؔ یہ قصے سنتا تو شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، پیشانی پر پسینہ چمکنے لگتا اور وہ گھبرا گھبرا کر سب کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا۔ مدتوں اس کیفیت سے گذرنے کے بعد بھی اس کی معصوم سمجھ میں یہ نہیں آ سکا تھا کہ اس نقار خانہ میں اس کی طوطی کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ اس کے مذہبی مزاج کو بھی اس معصومیت میں بہت دخل تھا۔ وہ نماز روزے کا سخت پابند تھا۔ بات بات میں ماشاءاللہ! سبحان اللہ! بڑی خوبصورت قراءت سے استعمال کرتا تھا۔ گالی یا فحش مذاق سن لیتا تو بری طرح جھینپ جاتا اور لاحول پڑھ کر بغلیں جھانکنے لگتا تھا۔ نہایت بے ضرر قسم کا آدمی تھا۔ ویسے لوگوں کا خیال تھا کہ اس پردہء زنگاری کے پیچھے چھپے ہوئے اخلاص احمدؔ کو ہمارے شرمیلے اخلاص احمدؔ سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ لیکن یہ صرف افواہ ہی تھی اور ہنوز تصدیق کی محتاج تھی۔ یوں تو وہ بہت سیدھا سادا شخص تھا لیکن اس کا مچیٹا سید کاظم حسینؔ سے مستقل چلا کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ برسوں کی بحث اور بے تکی چپقلش کے باوجود دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

سید کاظم حسینؔ لکھنؤ کے ایک معزز اور کھاتے پیتے شیعہ گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ جتنا اخلاص احمدؔ سنّی مسلک سے ناواقف تھا اسی قدر کاظمؔ شیعہ مسلک سے ناآشنا تھا۔ مگر مذہبی بحث دونوں بڑی شدومد سے کیا کرتے تھے۔ کاظمؔ کٹر شیعہ تھا اور محرم، ماتم اور متعہ کا سختی سے قائل تھا۔ بات بات میں مجتہد العصر کلب حسینؔ صاحب عرف کبن میاںؔ کا ذکر کرتا گویا موصوف کا ذکر ہر مذہبی بحث جیت لینے کے لئے کافی تھا! اُدھر اخلاص احمدؔ کو ضد تھی کہ شیعہ مذہب ''دھاندل بازی'' ہے! تاش کی میز پر بیٹھ کر دونوں اپنے اختلافات بھول جاتے تھے، شاید اس لئے کہ مختار بیڑیؔ دونوں کے پیسے بلاتخصیص مذہب وملت بٹورا کرتا تھا! لہذہ اس کی مخالفت میں شیعہ سنی اتحاد وقتی طور پر قائم ہو جایا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تاش کی بازی خشک ہوا کرتی تھی۔ بعد میں مختار بیڑیؔ نے سب کو یہ کہہ کر پیسے لگانے پر آمادہ کر لیا تھا کہ: ''یار منھ کا مزا بدلے گا! اور یوں بھی یہ سالا کوئی جوا تھوڑی ہے کہ چار چھ روپے لگے ہوئے ہیں!'' اب یہ ''چار چھ روپے'' بڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے اور ان میں سے بیشتر مختار بیڑیؔ کی جیب میں تھے!

اس چنڈال چوکڑی کا چوتھا کونا میں تھا۔ علی گڑھ کے ایک اوسط گھرانہ کا فرد، پڑھنے لکھنے کا شوقین اور ادب وشعر کی جانب رجحان! چنانچہ طبیعت کا بزدل اور جھگڑہ فساد سے خوف زدہ تھا! البتہ کاظمؔ اور اخلاص احمدؔ کی مستقل اور بے تکی بحث سے لطف اندوز ہونے میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ اخلاص احمدؔ بحث کے دوران کبھی کبھی کھسیا کر میری طرف مدد کی امید سے دیکھتا تھا لیکن میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا کہ یہ کھڑاگ مول لیتا۔ آج بھی تاش کی بازی مختار بیڑیؔ مستقل جیتے جا رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا وہ جھوم رہا تھا اور بیڑی کے کش پر کش لے کر پتے ہاتھ گھما گھما کر تڑاق تڑاق میز پر مار رہا تھا۔ ذرا ذرا دیر بعد دھواں اخلاص احمدؔ کے منھ پر چھوڑتا اور منمنا کر کہتا:

''یہ لو بیٹا! اس سالے کو کاٹو تو جانیں کہ اپنے باپ کی حلال اولاد ہو! سالے پہلے بھی کبھی کھیلا ہے کہ آج آ کر یہاں بیٹھ گیا!''

کاظم حسینؔ اس کو کھا جانے والی خونخوار آنکھوں سے گھورتا اور اخلاصؔ احمد بدبدا کر زیر لب شاید کوئی وظیفہ پڑھتا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اس بدتمیز کو سبق سکھایا جائے۔ ادھر روپوں کا یہ حال تھا جیسے انہیں مختار بیڑیؔ سے عشق ہو گیا ہو۔ میز پر آ کر اس ناہنجار کی جیب میں منتقل ہوتے ہوئے ان کو دیر نہیں لگتی تھی!

اچانک دروازہ پر ہلکی سی دستک ہوئی اور محمد علیؔ داخل ہوا۔ میں نے پوچھا کہ: ''کیوں بھئی کیا بات ہے؟'' اور اس نے جواباً ''ایک لفافہ کاظمؔ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''صاحب! رام سنگھ بریلی سے یہ چٹھی لایا ہے۔''

کاظمؔ نے لفافہ کھول کر پڑھا تو خط پڑھ کر کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا: ''مل گئی! چھٹی مل گئی!''

میں نے پوچھا: ''ابے کیسی چھٹی مل گئی جو مرا جا رہا ہے؟''

وہ مسکرا کر بولا: ''یار! میری شادی ہونے والی ہے۔ چھٹی کی درخواست بڑے صاحب نے منظور کر لی ہے!''

اخلاص احمدؔ کو تو جیسے خداداد موقع مل گیا۔ بڑی میٹھی مسکراہٹ سے بولا: ''میاں! تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے۔ متعہ کر لیتے متعہ! تمہارے تو سات خون معاف ہیں''

کاظمؔ جھلا کر کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ مختار بیڑیؔ نے گنگناتے ہوئے لہجہ میں کہا: ''ابے! اس پکوڑہ سی ناک پر تجھ کو اپنی بیٹی کون الو کی دم دے گا؟ اور ہی سالی شادی ہو کب رہی ہے؟''

معلوم ہوا کہ وہ الو کی دم جو کاظمؔ کی پکوڑہ سی ناک کے باوجود اس کو اپنی بیٹی دینے کو تیار تھا ضلع فتحپورؔ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب تھے! بیٹی ایم اے پاس تھی اور شادی دو ماہ بعد اپریل میں تھی۔ ہم لوگوں کو زبانی دعوت دے کر کاظمؔ نے اطمینان دلایا کہ باقاعدہ کارڈ بھی بھیجے گا اور شادی میں ہماری شرکت خود اس کی شرکت سے زیادہ ضروری ہے!

مختار بیڑیؔ نے میز سے روپے سمیٹتے ہوئے کہا: ''ابے، اپریل میں شادی کر رہا ہے؟ عقل گھاس کھا گئی ہے کیا؟ بچو! سارا مزا کرکرا ہو جائے گا، ہاں! سالے میری مان تو

آبا کو لکھ کے تاریخ بلوا لے ورنہ پچھتائے گا۔ جاڑوں میں رکھ جاڑوں میں، کیا سمجھا؟''

کاظم پر شادی کی خوشخبری کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ ایسی بے تکی باتوں پر دھیان دینے کا سوال کہاں اٹھتا تھا۔

اس اپریل سید کاظم حسینؔ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ گرمیوں نے ہمارا مزاج اطمینان سے پوچھا مگر دوست کی خاطر ہم لوگ فتحپورؔ تپتی دھوپ میں بس پر گئے اور مرغن کھانوں اور ٹھنڈی کوک سے جملہ غم بھلانے میں مصروف رہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (فتحپور) صاحب نے اپنے سرکاری اور غیر سرکاری اختیارات سے کام لے کر مہمانوں کی خاطر تواضع اور دلداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس ضلع میں آج اور کوئی کام نہیں ہوگا۔ کاظم حسینؔ شیروانی، ٹوپی سے لیس، سسرالی ہار پھول سے لدا پھندا اپنی پکوڑا سی ناک کے ساتھ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ سنا تھا کہ دلہن خوبصورت اور لاکھوں میں ایک ہے اور ہم لوگ اس خبر کی عینی تصدیق کے لئے مستقبل کے ابھی سے منتظر تھے۔ جہیز اور تحائف دیکھ کر البتہ کاظم کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ مختار بیڑیؔ کا خیال تھا کہ سامان لے جانے کے لئے ایک عدد بس فاضل کرنی ہوگی۔

پھر یوں ہوا کہ سب لوگ اپنی اپنی زندگیوں کو واپس چلے گئے۔ ہم لوگوں کی پوسٹنگ مختلف مقامات پر ہوگئی اور وہ ربط وضبط اور دوستی جو زندگی کا ایک حصہ تھی اب گنڈہ دار ہو کر رہ گئی۔ ایک دوسرے کی خبر مل جاتی تھی یا گاہے گاہے کہیں کسی بہانہ ملاقات ہو جاتی تھی۔

دیکھتے دیکھتے دو سال گذر گئے۔ کسی پروجیکٹ کے سلسلہ میں پی ڈبلو ڈی سینٹرل آفس (لکھنوء) جانا ہوا تو اخلاص احمدؔ برآمدہ میں نظر آ گیا۔ بے تحاشہ گلے ملے۔ ابے تبے ہوئی، ایک دوسرے کی خیر خبر پوچھی اور چند منٹوں میں کئی برس کا سفر طے ہو گیا۔ سچ پوچھئے تو ایسی ہی بے تکلف ملاقات پر اس گھسے پٹے شعر کا مطلب سمجھ میں آتا ہے:

اے دوست کسی ہم دم دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے!

خیر! اخلاص احمدؔ ایسے ٹھس مسلمان کو تو اس شعر کا مطلب کی سمجھاتا! اس سے علی گڑھؔ اور پرانے دوستوں کا ذکر ضرور رہا۔ مختار بیڑیؔ کانپور میں کہیں جھک مار رہا تھا۔ خود اخلاصؔ احمد بنارس میں گنگا اشنان کرتا تھا اور بظاہر خوش نظر آ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں جب اس نے کہا کہ: ''یار! وہ اپنا کاظم بھی آج کل یہیں آیا ہوا ہے۔'' تو قسمت کی اس نیرنگی پر خوشی کا نعرہ لگانے کو دل چاہا۔ لیکن میری بیتابی میں اخلاص احمدؔ شریک نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت پوچھا مگر اس نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا اور صاف کچھ بتا کر ہی نہیں دیا۔ البتہ میرے کہنے سننے سے اس پر راضی ہو گیا کہ دونوں چل کر کاظم کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اس کی بے دلی کا راز کھوجنے کا ارادہ میں نے آئندہ کے لئے ملتوی کر دیا۔

لکھنو میں پی ڈبلو ڈی (P. W. D.) کا دفتر کیا ہے بھول بھلیاں ہے! دفتر کے اندر دفتر، اور عمارت کے اوپر عمارت! پھر ہر جگہ سرکاری ضابطہ کی کارروائی اور چپراسیوں کی فوج ظفر موج! پوچھتے پوچھتے خاصہ وقت لگ گیا مگر ڈھونڈے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے! آخر کاظم کا پتہ بھی معلوم ہو ہی گیا۔ اس کے عارضی دفتر پہنچ کر میں نہایت بے تابی سے داخل ہوا کہ برسوں کا پرانا یار ملے گا! اور داخل ہوتے ہی یک لخت ٹھٹھک کے کھڑا کا کھڑا رہ گیا! میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھا شخص سید کاظم حسینؔ تو یقینی طور پر تھا لیکن وہ کاظم نہیں تھا جس کے ساتھ علی گڑھؔ میں اتنے خوشگوار سال گذرے تھے! سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑے ہوئے، چہرہ سے وحشت ٹپکتی ہوئی، گدلی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی اور پکوڑہ سی ناک جواب پچک کر پھلکی سی ہو کر رہ گئی تھی! میں یہ حلیہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے ملوں اور کیا کہوں!

کاظم جیسے بادل نخواستہ اٹھ کر ملا، رسماً ''خیریت پوچھی، چپراسی سے چائے لانے کو کہا اور پھر سر جھکا کر فائل گھورنے لگا۔ میں نے اپنی سی کوشش کی کہ گپ شپ ہو۔ کبھی علی گڑھؔ کا ذکر کرتا اور کبھی مدت سے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کا حال کہہ کر اسے گفتگو کی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتا، مگر جیسے اسے کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ مَری مَری آواز سے ہوں ہاں کرتا رہا، مسکراتا تو ایسے جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔ اُدھر اخلاص احمدؔ نے میز سے ایک فائل اٹھالی تھی اور ایسے انہماک سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا جیسے یہ اس کا اپنا پروجیکٹ ہو اور یہاں آنے کا وہی واحد مقصد بھی ہو۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے کاظم سے کہا: ''اور سناؤ، بیگم اور بچے کیسے ہیں؟ کتنے بچے ہیں تمہارے ماشاءاللہ؟''

سوال کا سننا تھا کہ کاظم حسین کے چہرہ پر جانے کتنی وارداتیں گذر گئیں۔ اس کا خاصہ پکا رنگ فق سا ہو کر رہ گیا۔ ایک غبار سا تھا کہ چہرہ کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ آنکھیں ایسی ویران کہ دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ ایسا سکڑ کر رہ گیا تھا جیسے اک دم بے جان ہو۔ میں ابھی کچھ سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ اخلاص احمدؔ نے میز کے نیچے میری پنڈلی پر اپنے پاؤں سے ٹہوکا دیا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے آنکھ کے اشارہ سے جیسے کہا کہ: '' بھائی! اب بس کرو!''۔ میں خود ہی حالات سے سٹپٹایا ہوا تھا، خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ اب ماحول بہت بوجھل ہو چلا تھا اور تین لوگوں کی موجودگی میں بھی کمرہ سونا سونا محسوس ہوتا تھا۔ چند منٹ بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور کاظم سے خدا حافظ کہہ کے اخلاص احمدؔ کے ساتھ باہر نکل آیا۔

چند قدم چل کر میں نے اخلاص احمدؔ سے پوچھا: ''یار یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ کاظمؔ کو کیا ہو گیا ہے؟ بیمار ویمار ہے کیا؟''

اخلاصؔ نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا: ''کیا کرو گے پوچھ کر؟ کوئی اور بات کرو یار۔ میں تو پہلے ہی چاہتا تھا کہ تم اس سے نہ ملو۔''

''مگر آخر معلوم تو ہو کہ قصہ کیا ہے! دو سال پہلے تک تو ٹھیک ٹھاک تھا یہ۔ یاد نہیں شادی پر کیسا خوش تھا؟ بیوی بچے تو ٹھیک ہیں اس کے؟''

اخلاص احمدؔ نے ذرا سے تامل سے جواب دیا: ''بچے تو کوئی نہیں ہیں اس کے۔ ہاں بیگم ہیں اس کی۔ تم بھی کیا لے بیٹھے۔ چلو شام میں کوئی فلم دیکھیں گے اور حضرت گنج کی سیر کریں گے۔''

مگر میں ایسی آسانی سے چھوڑنے والا کب تھا۔ میری مستقل کرید سے شاید عاجز آ کر اخلاص احمدؔ اس شرط پر تفصیل بتانے پر راضی ہوا کہ کاظمؔ سے پھر ملاقات ہونے کی صورت میں اس موضوع پر اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔

راوی کا بیان ہے کہ کاظم حسینؔ شادی کے بعد گھر پہنچا تو خوشی سے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بیگم شکل وصورت اور تعلیم میں لاکھوں میں ایک تھیں۔ پھر اپنے گھر بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ مستقبل کچھ اپنی تعلیمی سند اور کچھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کی مہربانیوں کی بدولت روشن ہی روشن نظر آ رہا تھا۔ تیسے چوتھے دن جب ذرا خمار اترا تو شادی میں ملے ساز وسامان کی جانب بھی توجہ گئی۔ ایک ایک چیز دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ تحفہ دینے والے کا نام ایک فہرست میں لکھتے جاتے تھے کہ فرصت سے شکریہ کا کارڈ بھیج دیا جائے گا اور آئندہ کسی حیلہ سے جوابی تحفہ دینا بھی ضروری ہوگا۔ زیورات ، جوڑوں اور ساریوں کا ایک ڈھیر تھا کہ ختم ہی نہیں ہونے میں آتا تھا۔ بیگم ثمینہؔ بھی فہرست سازی میں شریک تھیں اور آپس کی چھیڑ چھاڑ اس کام کے لطف کو دوبالا کر رہی تھی۔

کاظمؔ نے ایک بڑا خوبصورت پیکٹ اٹھایا، مگر اس پر کوئی نام درج نہیں تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دلھن کی جانب دیکھا تو ثمینہؔ نے معصومیت سے کندھے اچکا کر مسکرا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کاظمؔ نے پیکٹ ثمینہؔ کو دیتے ہوئے کہا کہ: ''لو! اس کو تم کھولو۔'' ثمینہؔ نے کاغذ پھاڑا اور ڈبہ میں ہاتھ ڈالا تو اس میں گلابی رنگ کا باریک سا کپڑا تھا۔ دونوں ہاتھوں پر پھیلایا تو دیکھا کہ گلابی ریشم کی نہایت ہی خوبصورت مچھر دانی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ثمینہؔ کے ہاتھ سے مچھر دانی کا سرا چھوٹ گیا۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا تو ایک جاتا تھا۔ کاظمؔ اس کا یہ حال دیکھ کر پہلے تو گھبرایا، پھر کچھ شک میں آ کر بولا: ''ثمینہؔ یہ مچھر دانی کس کا تحفہ ہے؟''

ثمینہؔ نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے جواب دیا: ''جی! مجھ کو نہیں معلوم!''

لیکن کاظمؔ سمجھ گیا تھا کہ اس مچھر دانی کے پیچھے کوئی راز ہے۔ نئی دلھن سے وہ امید رکھتا تھا کہ وہ دل کی کوئی بات شوہر سے نہیں چھپائے گی۔ پھر اس خوبصورت مچھر دانی کو دیکھ کر دل میں طرح طرح کے وسوسے بھی آتے تھے کہ معلوم نہیں کالج میں کن کن وارداتوں سے گذر چکی ہو! وہ مچھر دانی کاظمؔ کو کھائے جا رہی تھی۔ اسے بس یہی دھن تھی کہ اس کے بھیجنے والے کا نام معلوم ہو جائے۔ وہ ثمینہؔ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ دن رات کا یہی سوال تھا کہ مچھر دانی کس کا تحفہ ہے؟ شادی شدہ زندگی ابھی شروع ہوئی تھی کہ اس مصیبت کا سامنا پڑ گیا۔ آخر ایک دن عاجز آ کر غریب ثمینہؔ نے بتا ہی دیا کہ یہ اس کے چچازاد بھائی ظفرؔ کا تحفہ تھا جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کاظمؔ نے اس کو اقبال جرم سمجھا اور پھر الزام اور تہمت کا ایک نہ تھمنے والا دھارا اپنی نئی نویلی دلھن کی جانب موڑ دیا!

''تو یوں کہو کہ یہ عشق کی نشانی ہے! تم بھی اس سے شادی کرنی چاہتی ہوگی ورنہ اس کی ہمت مچھر دانی جیسی چیز بھیجنے کی کیسے ہوتی؟''

''پھر تحفہ پر اپنا نام نہ لکھنا کیا معنی؟ یہی نہ کہ سوائے تمہارے یہ راز کسی اور کو معلوم نہ ہو۔ اس مچھر دانی میں تم میرے ساتھ سوتی ہو! تمہیں میری عزت کا خیال نہیں؟''

''شریف لڑکیوں کے یہی کرتوت ہوتے ہیں کیا؟ ابھی سے یہ حال ہے تو آئندہ کیا ہوگا؟ اور اس کم بخت نے تمہیں کیا کیا دیا ہے، بتاؤ!''

ثمینہؔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتی کہ وہ بے قصور ہے اور ظفرؔ سے کبھی اس کا کوئی قابل اعتراض تعلق نہیں رہا لیکن کاظمؔ پر غصہ اور شک وشبہ کا وہ بھوت سوار ہو چکا تھا جو بغیر قربانی لئے نہیں اترتا ہے۔

اور آخر ایک دن کاظمؔ نے ثمینہؔ سے صاف صاف کہہ دیا: ''میرے سامنے اس مچھر دانی کو اپنے ہاتھوں سے جلا دو، ورنہ آئندہ تم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہوگا!''

ثمینہؔ نے بہت سمجھایا: ''بھلا سوچئے تو سہی کی آپ کیا کہہ رہے ہیں! بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہے ہیں؟ میں تو مچھر دانی نہیں جلاؤں گی۔ آپ چاہیں تو خود جلا دیں!''

کاظم کا بھوت اتنی آسانی سے بھلا کب اترنے والا تھا۔ ہاتھ کھینچ کر ثمینہؔ کو آنگن میں لے گیا اور مچھر دانی اس کے سامنے پھینک کر گرجتا ہوا بولا: ''جلاؤ گی کیسے نہیں! جلانا پڑے گا ورنہ آج اچھا نہیں ہوگا!''

جیسے جیسے ثمینہؔ کے آنسو تیز ہو رہے تھے اس کا غصہ بھی بڑھتا جاتا تھا اور جو بھی اس کے منھ میں آ رہا تھا اگل رہا تھا۔ ثمینہؔ کی قوت برداشت آخر کب تک اس کا ساتھ دیتی۔ بڑے کرب سے بولی: ''لایئے دیجئے دیا سلائی! ابھی جلائے دیتی ہوں!''

پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے دیا سلائی سلگا کر مچھر دانی پر پھینک دی اور آنسو بھری آنکھوں سے اسے دم بھر میں راکھ ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ مچھر دانی کے ساتھ اور کیا کیا اسے راکھ ہوتے دکھائی دیا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ وہ پیار جو شوہر کے لئے لے کر آئی تھی؟ یا وہ اعتبار اور اعتماد جو دو جیون ساتھیوں میں محبت کا ضامن ہوا کرتا ہے؟ وہ معصومیت جس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور جسے ایک گھناؤنے الزام سے نوازا گیا؟ کون جانے وہ مچھر دانی اپنے ساتھ کیا کیا لے گئی۔ ثمینہؔ بھی اس راز کو نہیں کھول سکی۔ وہ خود بھی اب راکھ کا ایک ڈھیر ہو چکی تھی۔

راوی کہتا ہے کہ ثمینہؔ مچھر دانی جلا کر ایسی خاموش ہوئی کہ پھر کبھی نہیں بولی۔ اب وہ اپنے حواس کھو چکی ہے اور خود سے بہکی بہکی باتیں کیا کرتی ہے۔ کسی بستر پر مچھر دانی دیکھ لیتی ہے تو چیختے چیختے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ سنے ہے کہ کاظم حسینؔ کی راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ اگر ذرا بھی آنکھ لگ جاتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور یوں چہرہ اور کپڑوں جھاڑنے لگتا ہے جیسے وہ خاک دھول میں اٹ گئے ہوں، یا شاید مچھر دانی کی اس راکھ میں جو اپنے دامن میں معلوم نہیں کیا کیا سمیٹ کر لے گئی ہے!

سوئمنگ پول پارٹی

آج امام فخر الاسلامؔ صاحب نہایت خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ یوں تو عادتاً ''ہمیشہ مسکرایا ہی کرتے تھے لیکن آج ان کے چہرہ کی بشاشت اور سیاہ آنکھوں کی چمک کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ بار بار ان کا ہاتھ سرخ و سفید چہرہ پر سجی ہوئی داڑھی پر جاتا اور اس میں کنگھی کرتا ہوا ناک پر سنہری کمانی کا چشمہ سیدھا کرتا ہوا ان کی گود میں واپس آ جاتا۔ وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر رہ رہ کر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالتے پاس ہی بیٹھے چودھری شریف احمدؔ کو مسکرا کر دیکھتے اور پھر لمحہ بھر کو آنکھیں موند کر کسی خیال میں کھو جاتے تھے۔ سچ پوچھئے تو انہیں اس خوشی اور فخر کا پورا حق بھی تھا۔ ان کی ہی کوششوں سے مسجد میں اسلامی اسکول قائم ہوئے پورا ایک سال ہو گیا تھا اور آج کے اجلاس میں ان بچوں کو انعامات تقسیم کئے جانے والے تھے جنہوں نے اسلامی تعلیم کے کسی شعبہ میں خصوصی محنت اور کامیابی دکھائی تھی۔ امریکہ میں مسلمان بچوں کو اسلامی کاموں میں لگائے رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ جہاں قدم قدم پر عیش و آرام کے سامان اور ہر قسم کا لالچ اور ان سے لطف اندوز ہونے کے مواقع میسر ہوں وہاں اسلام کی روکھی سوکھی سپاہیانہ روایات اور تعلیمات پر کون چلنا چاہتا ہے؟ یہ امام صاحب کی لگن اور محنت ہی تھی جس نے آج کا دن دکھایا تھا۔ شہر کے وہ لوگ جن کو اپنی اولاد کو امریکہ کی مسموم فضا سے محفوظ رکھنے کا خیال تھا کثیر تعداد میں محفل میں موجود تھے اور مغرب کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر مسجد کے ہال میں فرش پر بیٹھے ہوئے تقریب شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ محراب کے سامنے کرسیوں پر امام فخر الاسلامؔ صاحب اسکول کے پرنسپل چودھری شریف احمدؔ صاحب، مسجد کی مجلس شوری کے صدر اور مسجد کے بلا شرکتِ غیرے مالک ڈاکٹر عبد الطیفؔ شیخ بیٹھے ہوئے تھے۔ مسجد کی سب سے پچھلی صفوں پر دیوار سے لگی عورتیں بیٹھی آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ایک جانب وہ لڑکے اور لڑکیاں بے چینی سے کروٹیں بدلتے بیٹھے ہوئے تھے جن کو انعامات ملنے والے تھے۔

چودھری شریف احمدؔ ایک متقی، پرہیزگار اور مسکین آدمی تھے۔ دن رات مسجد کی خدمت میں مصروف رہا کرتے تھے اور تعلیمی مسائل میں تجربہ کی کمی کو اپنے خلوص اور محبت سے پورا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ڈاکٹر شیخ صاحبؔ شہر کے نامور سرجن اور اس سے بھی زیادہ نامور سیاست داں تھے۔ ایک مدت سے مسجد پر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قابض تھے اور کوئی کام ان کے مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ صورت حال ان کی بے تحاشہ دولت اور بے مثال سیاسی مہارت کا نتیجہ تھی۔ لوگ ان کی پیٹھ پیچھے تو خوب برا بھلا کہہ لیتے تھے اور ان کے غرور اور خود پرستی کا مذاق بھی اڑا لیتے تھے، لیکن ان کے سامنے چاپلوسی اور خوشامد سے کام لیتے تھے کہ کہیں ڈاکٹر صاحب خفا نہ ہو کر ان پر اپنے کرم کا وہ دروازہ نہ بند کر دیں جو وہ تقریباً'' ہر ماہ پارٹی کی صورت میں کھولا کرتے تھے۔ دولت بھی عجیب چیز ہے۔ ایک طرف تو یہ مالداروں کے سب عیب چھپا لیتی ہے اور دوسری طرف انہیں عزت اور طاقت بھی عطا کرتی ہے جس کے وہ اکثر مستحق بھی نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کو استعمال کا سلیقہ ہی ہوتا ہے۔ ایک موقعہ پر کسی دل جلے نے ڈاکٹر صاحب کی مغرور اور بے لگام طبیعت دیکھ کر اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے ان سے کہہ دیا تھا کہ: ''ڈاکٹر صاحب! دولت دنیا میں ہر چیز نہیں ہے!''

اس پر ڈاکٹر شیخ صاحب نے نہایت اطمینان سے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا: ''جی ہاں! ہر غریب یہی کہتا ہے!''

اور وہ صاحب اپنا سا منھ لے کر رہ گئے تھے!

جلسہ امام صاحب کی تقریر سے شروع ہوا۔ انہوں نے بڑی پتے کی باتیں کہیں۔ ہم امریکہ ڈالر کے چکر میں آ تو گئے تھے مگر اب امریکہ سانپ کے منھ میں چھچھوندر ہو کر رہ گیا تھا! نہ اگلتے بنتا تھا اور نہ ہی نگلتے! یہاں کی ڈالر زدہ، مادہ پرست زندگی غیر اسلامی اور گندا معاشرہ، عیاشیاں اور اس کی تمام سہولتیں ہماری روایات اور اقدار سے دن رات جنگ آزما تھیں اور بیشتر فتحیاب بھی۔ ہمارے بچے یہاں کی تعلیم، آزادی اور بے راہ روی کا شکار ہو کر اسلام سے بے گانہ ہوتے جا رہے تھے۔ والدین ان حالات میں خود کو نہایت مجبور پاتے تھے جہاں سترہ سال کی عمر کے بعد بچے خود مختار اور قانونی طور پر والدین کی باز پرس سے آزاد ہو جاتے تھے۔ کتنے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مقامی امریکن غیر مسلموں سے شادیاں کر رہے تھے اور جو شادیاں مسلمان گھرانوں میں ہو بھی رہی تھیں ان میں طلاقیں بھی خوب ہو رہی تھیں۔ ایسے ماحول میں اپنی اور بچوں کی زندگیوں میں اسلام قائم کرنا ہمارا اولیں فریضہ تھا۔ یہ بات قابل افسوس تھی کہ امریکہ کی مشینی اور مصروف زندگی میں بہت سے لوگوں نے اپنے ہاتھ پیر ڈال دئے تھے اور جو لوگ اس راہ میں محنت کر بھی رہے تھے

وہ بہت سی مشکلات کا شکار تھے۔ پھر بھی اللہ کے فضل و کرم سے امید تھی کہ کام آگے بڑھے گا اور اسلام کی جڑیں آئندہ نسلوں میں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی۔ اس عظیم اور اہم کام کو کرنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر چل کر اسلام کا نام بلند کریں۔

تقریر کے اختتام پر امام فخر الاسلاؔم صاحب نے اللہ تعالی سے بڑے رقت آمیز انداز میں دعا مانگی کہ وہ ہمارے ارادوں اور کوششوں میں کامیابی عطا فرمائے اور دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا ہو۔ دعا پر آمین کہتے ہوئے چودھری شریف احؔمد کی آواز حسب معمول سب سے زیادہ نمایاں اور بلند تھی۔ اس کے خلوص کی شدت سے گھبرا کر ڈاکٹر شیخ صاحب نے آواز سے آواز ملانے کی کوشش کی تھی اور پھر فاتحانہ انداز میں محفل کو گردن ہلا ہلا کر دیکھا تھا گویا کہہ رہے ہوں کہ: ''دیکھو! مسجد ایسے چلائی جاتی ہے!''

چودھری شریف احؔمد نے مائک سنبھالا تو سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے۔ انعام پانے والے لڑکے اور لڑکیاں پُر امید نگاہوں سے ان کی جانب متوجہ ہو گئے اور وہ چند لوگ بھی جو مسجد کی بغلی دیوار کا سہارا لئے بے دلی سے بیٹھے تھے اور زیادہ کھا جانے کی وجہ سے اونگھ رہے تھے ہوشیار سے ہو گئے۔ چودھری صاحب نے اپنی پاکستانی انگریزی میں اسکول کے مقاصد اور گذشتہ سال کی روداد پر اظہار خیال کیا، اللہ کا شکر ادا کیا اور اسکول کے ہونہار بچوں کی محنت کو سراہا:

''بھائیو اور بہنو! مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے اسکول کے کئی بچوں نے نہ صرف اسلامیات میں ہی محنت اور شوق سے کام کیا ہے بلکہ اپنے اپنے امریکن اسکول میں بھی مختلف میدانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ میں مسجد کے اسکول کے انعامات سے پہلے ان بچوں سے آپ کہ متعارف کرانا چاہتا ہوں جنہوں نے مختلف اسکولوں میں اچھی کارگذاری دکھائی ہے۔ امام صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اپنے دستِ مبارک سے مسجد کی جانب سے انہیں انعامات تقسیم کریں۔''

چودھری صاحب کی سوالیہ نظروں کے جواب میں امام فخر الاسلاؔم صاحب نے مسکرا کر سر کی جنبش سے انہیں اجازت کا اشارہ کیا۔ چودھری صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر نظر ڈال کر مائک سنبھالا۔

''محمد حنیف خاؔن! انہوں نے اپنے اسکول کے سائنس پروجیکٹ کے مقابلہ میں انعام جیتا ہے!''

فرش پر بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے ایک خوش شکل لڑکا اٹھ کر آگے بڑھا۔ امام صاحب نے اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر اس کو گلے لگایا اور کمال محبت سے خوبصورت رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا انعام اسے دیا۔ لڑکے کا چہرہ فخر سے تمتما رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

چودھری صاحب نے پھر اعلان کیا: ''راشؔدہ صدیقی! انہوں نے اپنے اسکول کا جونئر اسپیلنگ ایوارڈ (Junion Spelling Award) جیتا ہے!''

محفل سے ایک دس گیارہ سال کی خوبصورت بچی شلوار قمیص میں ملبوس اور حجاب سے سر ڈھانکے شرمائی شرمائی سی اٹھ کر آئی۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں سے کھی کھی کی معصوم ہنسی کی ہلکی جھنکار ابھر کر اِدھر اُدھر بکھر گئی۔ راشؔدہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل کر امام صاحب تک پہنچی اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ امام صاحب یوں چونک کر اک دم پیچھے ہٹ گئے کہ راشؔدہ بھونچکا سی ہو کر ان کو دیکھنے لگی اور اس کا ہاتھ بیچ ہوا میں ہی لٹکا رہ گیا۔ ساری محفل اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

امام صاحب نے چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ پہن کر مائک میں اعلان کیا: ''اسلام میں مردوں اور غیر عورتوں کا میل ملاپ اور مصافحہ منع ہے۔ ہمیں اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں راشؔدہ یا کسی اور لڑکی سے ہاتھ نہیں ملا سکتا ہوں۔ یہ شرع کے خلاف ہے۔ ہاں اس کی کامیابی پر مجھ کو بہت مسرت ہے اور میں دعاؤں کے ساتھ اس کو یہ انعام پیش کرتا ہوں۔''

امام صاحب کے سامنے حیران و پریشان کھڑی راشؔدہ نے ڈرتے ڈرتے ان کے ہاتھ سے انعام لیا اور پلٹ کر واپس اپنی سہیلیوں میں سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ محفل پر جیسے اوس سی پڑ گئی تھی اور سارا ماحول بجھ کر رہ گیا تھا۔ یہ امریکہ تھا۔ یہاں بیشتر لوگوں کی بیویاں ادھر اُدھر ملازمتیں کرتی تھیں اور ان کے بچے پبلک اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جہاں اور باتوں کے علاوہ مرد اور عورت کی برابری کی تعلیم عام تھی۔ مسجد میں امام صاحب کے احترام میں لوگ خاموش تو تھے لیکن اکثر اشخاص خوش نہیں معلوم ہو رہے تھے۔

چودھری شریف احؔمد صاحب نے جلسہ کی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہوئے اعلان کیا: ''تمام لڑکیوں سے درخواست ہے کہ وہ انعام لیتے وقت امام صاحب سے ہاتھ نہ ملائیں۔ اسلامی اصولوں کی پابندی ہم پر لازم ہے!'' پھر انہوں نے کاغذ پر نظر ڈال کر کہا:

''نادیہ افتخاؔر! انہوں نے اپنے اسکول میں تیراکی کے مقابلہ میں تمغہ حاصل کیا ہے!''

ابھی چودھری صاحب اعلان سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ امام صاحب چونک کر اک دم کھڑے ہو گئے۔ ان کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا اور چہرہ غم و غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر نادؔیہ اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے رک گئی۔ ساری محفل حیرانی سے امام صاحب کا منھ تک رہی تھی!

امام فخر الاسلام صاحؔب نے آگے بڑھ کر چودھری صاحب کے ہاتھوں سے مائک لے لیا، چند لمحے اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے خاموش رہے اور پھر کانپتے ہاتھ سے

مائک ہونٹوں تک لا کر محفل سے مخاطب ہوئے:

''اللہ اکبر! اللہ اکبر! میں نے تو یہ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے یہ دن دیکھنا پڑے گا۔ غضب خدا کا! مسلمان بچیاں اسکول میں تیرتی ہیں اور مقابلوں میں حصہ بھی لے رہی ہیں؟ کیا ان کے والدین کو معلوم نہیں ہے کہ تیرنے کے لئے لڑکیوں کو کیسا چست اور شرمناک لباس پہننا پڑتا ہے؟ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ سوئمنگ پول میں لڑکے اور لڑکیاں سب ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ تماشائیوں میں بھی مرد اور عورتیں سبھی ہوتے ہیں۔ اسلام میں لڑکیوں اور عورتوں کو حجاب کا حکم ہے۔ پھر بھلا یہ کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے کہ ہماری بیٹیاں تیرنے کا لباس پہن کر دنیا کے سامنے بے حیائی کا مظاہرہ کریں؟ یہ تو سراسر حرام کام ہوا! میں اس بچی کو اپنے ہاتھ سے انعام نہیں دے سکتا ہوں اور اس کے والدین کے لئے نیک ہدایت کی دعا کرتا ہوں۔''

اس تقریر سے محفل پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نادیہؔ آنسوؤں بھری آنکھیں لئے سر جھکائے مجرم کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔ کہاں تو وہ یہ امید لے کر آئی تھی کہ انعام ملے گا اور کہاں نہ صرف اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا تھا بلکہ سب لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی بھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے ایسا کیا قصور سرزد ہوا تھا! اس سانحہ کے بعد تقریب کا رنگ بالکل ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ انعامات بھی تقسیم ہوئے اور ایک آدھ تقریر بھی ہوئی لیکن کسی جانب سے مسرت اور جوش کا اظہار نہیں ہوا، لوگ بے دلی سے بیٹھے رہے اور بے دلی سے ہی اٹھ کر دبے الفاظ میں چہ می گوئیاں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

ڈاکٹر نذیر احمدؔ کی پول پارٹی (Pool Party) سارے شہر میں مشہور تھی۔ وہ نہایت اچھے سرجن تھے اور ان کی شہرت دور دور تک تھی۔ پھر اللہ کے فضل و کرم سے بیگم بھی ڈاکٹر تھیں۔ چنانچہ گھر میں پیسے کی وہ ریل پیل تھی کہ اللہ اکبر! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس دولت کو کہاں خرچ کیا جائے۔ دونوں بیش قیمت کاریں چلاتے تھے، نفیس سے نفیس کپڑوں میں آراستہ رہتے تھے۔ بیگم احمدؔ کے پاس ہر جوڑے کے ساتھ کا میچ کرتا ہوا زیورات کے سیٹ تھے ان کو ایک جوڑا کسی نے دو بار پہنے نہیں دیکھا تھا۔ اولاد کی جانب سے بھی فارغ ہو چکے تھے اور دونوں بیٹے شادی کے بعد اپنا اپنا گھر بسائے ہوئے تھے۔ اب دونوں میاں بیوی شہر کے سب سے شاندار حصہ میں ایک محل نما مکان میں رہتے تھے جس کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ کے لئے کئی ملازم لگے ہوئے تھے۔ میں نے تو خیر ان کا گھر اندر سے نہیں دیکھا تھا لیکن راوی کا بیان تھا کہ اس میں آٹھ کمرے اور دس غسل خانے تھے! یہ اور بات ہے کہ دونوں کو دو چار کمروں کے علاوہ باقی مکان کی زیارت کا وقت اور موقع، بلکہ ضرورت! کبھی کبھار ہی میسر آتے تھے! مکان سے ملحق ایک خوبصورت چھوٹا سا مکان مہمان خانہ کے طور پر بنا ہوا تھا اور عقبی لان میں بہت بڑا بیضوی شکل کا سوئمنگ پول (Swimming Pool) تھا جس کا فرش اور دیواریں نیلی قیمتی ٹائل سے سجے ہوئے تھے۔ جب پانی کے اندر دیواروں میں لگی ہوئی بجلی کی قندیلیں روشن ہوتیں تھیں تو جھلمل جھلمل کرتا شفاف پانی نہایت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

ڈاکٹر نذیر احمدؔ ہر دوسرے تیسرے ماہ ایک پول پارٹی (Pool Party) منعقد کرتے تھے اور لوگ اس میں شرکت کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ دراصل یہ پارٹی صرف نام کی ہی پول پارٹی ہوا کرتی تھی۔ امریکن پول پارٹی میں لوگ سوئمنگ سوٹ پہن کر تیرنے اور پول (Pool) میں آپس میں چہلیں کرنے میں وقت گذارتے ہیں۔ گاہے گاہے باہر نکل کر کھانے اور بیر (beer) پینے کا شغل کرتے ہیں اور قریب ہی بجتے ہوئے اسٹیریو سسٹم (Stereo System) پر بجتی ہوئی گرما گرم دھنوں پر ناچتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں تیرنے اور پینے پلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ کھانا ضرور ہوتا تھا اور ٹیپ لگا کر فلمی گیت بھی بجائے جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی جانب کسی کا دھیان مشکل سے ہی جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مفت میں شاندار کھانا مل رہا ہو اور یار دوست مل کر تیری میری برائی کر رہے ہوں تو فلمی گانوں کی کس کو فکر ہو سکتی ہے!

آج بھی لوگ ہمیشہ کی طرح مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ دیر سے آنے شروع ہوئے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو امریکن پارٹیوں میں گھڑی دیکھ کر بالکل صحیح وقت پر پہنچتے تھے۔ دیسی پارٹیاں اس اصول سے مطلق آزاد تھیں! کوئی شخص وقت پر نہیں آتا تھا بلکہ جو زیادہ دولت مند تھے وہ اسی حساب سے دیر سے آتے تھے تاکہ لوگوں کی نظروں میں ان کی شخصیت اور ان کی بیگمات کی سج دھج اور زیورات اچھی طرح آ جائیں! لوگوں نے محفل میں پہنچتے ہی میزوں کے گرد سلیقہ سے لگی کرسیاں اِدھر اُدھر کھینچ کر اپنے اپنے مخصوص حلقے بنا لئے تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ایک گروہ ان دولت مند لوگوں کا تھا جو ہر شخص اور ہر چیز کو ڈالر کے ہرے پیمانے پر تولنے کے عادی تھے اور جن کے نزدیک معمولی حیثیت والے لوگ کم وقعت بھی تھے۔ شرافت اور نجابت کے معنی سے یہ لوگ کم ہی واقف تھے۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو صوبہ یا زبان کی بنیاد پر گروہ بندی کے قائل تھے۔ یہ لوگ چن چن کر اپنی میز کے گرد اپنے ہم زبان لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور دوران گفتگو ان کو اس سے سروکار نہیں رہتا تھا کہ میز پر کوئی شخص ایسا بھی موجود ہے جو ان کی صوبائی زبان سے ناواقف ہے! انہیں اپنے تعصب میں دوسروں کے جذبات و احساسات کا بالکل پاس نہیں رہتا تھا۔ ایک میز پر ایسے لوگ بیٹھے تھے جن کا تعلق ایک خاص علاقہ سے تھا۔ یہی علاقائی مشترک قدر ان کا تعصب بن کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے شہر میں ایک الگ انجمن بھی بنا رکھی تھی جو ''غیر علاقائیوں'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ ان سب فرقوں اور گروہوں

کو دیکھ کر کوئی یہ مشکل سے ہی کہہ سکتا تھا کہ ان میں اسلام نام کی کوئی قدرِ مشترک بھی ہے۔ جن قبائلی اور سماجی تعصّبات کو ختم کرنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا وہ سب یہاں پوری شدت سے موجود اور زندہ تھے!

محفل کی دوسری جانب ایسے ہی گروہوں میں بٹی ہوئی، زرق برق لباسوں میں غرق اور سر سے پیر تک بیش قیمت زیورات میں ڈوبی ہوئی خواتین میزوں کے اردگرد بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کا محبوب موضوع لباس اور زیورات کی تعریف اور نمائش اور ایسی بیگمات کی برائی تھا جو اس وقت اس میز پر موجود نہیں تھیں! ہر ایک کی کوشش تھی کہ کسی طرح بقیہ دوسری بیگمات اس کے زیورات اور جوڑے کی جانب متوجہ ہو جائیں اور تعریف بھی کریں۔ وہ زردار دوپٹے جو چند منٹ قبل مغرب کی اذان سنتے ہی سروں پر بڑے ادب سے لپیٹ لئے گئے تھے، اب بے پروائی سے شانوں سے لٹک کر لان کے بوسے لے رہے تھے۔ اللہ کا حق ادا ہو چکا تھا اور اب اپنی انا کا حق ادا ہو رہا تھا!

پارٹی کے شور شرابہ میں بچوں کا خیال کم لوگوں کو ہی رہتا تھا۔ چنانچہ بہت سے چھوٹے بڑے بچے لان میں کرسیوں اور سوئمنگ پول کے اردگرد کھیل کود میں مصروف، چیختے چلاتے، لڑتے جھگڑتے اور ہنستے بولتے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ انہیں بچوں کو والدین امریکن پارٹیوں میں یا تو لے نہیں جاتے تھے یا پھر اپنی نگرانی اور دیکھ بھال میں قاعدہ سے رکھتے تھے۔ ''دیسی پارٹیاں'' اس اخلاقی اصول کی پابند نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اس ہنگامہ کے درمیان پول کے کنارے پڑی ہوئی پک نک کی میز کے اردگرد چند لڑکیاں بیٹھی معصوم گپ شپ اور ہنسی ٹھٹھول میں مشغول تھیں جو اس عمر کی لڑکیوں کا خاصہ ہے۔ پاس ہی رکھے ہوئے ٹیپ رکارڈر پر فلمی گانے لگے ہوئے تھے جن کی جانب حسب معمول کسی مہمان کی توجہ نہیں تھی۔

اچانک ایک زوردار چھپاک کی آواز فضا میں گونجی اور سوئمنگ پول کے پاس سے لوگوں کی چیخ پکار کی دل خراش آوازوں نے محفل پر سکتہ کا سا عالم طاری کر دیا تھا۔ سب لوگ بھاگ کر پول پر پہنچے جہاں کچھ لوگ ہکا بکا بُت بنے کھڑے تھے اور کچھ پول کے آس پاس پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

''ارے جاؤ! فائر برگیڈ کو فون کرو! کود جاؤ بھئی، کود جاؤ!'' کی چیخیں گونج رہی تھیں جن میں عورتوں کے بین کر کے رونے کی آوازوں نے مل کر قیامت کا منظر پیدا کر دیا تھا۔ سوئمنگ پول میں گرا ہوا ایک بچہ غوطے کھا رہا تھا اور ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ یکا یک بھیڑ کو چیرتی ہوئی ایک لڑکی دوڑ کر کنارے پہنچی، اس نے سر سے دوپٹہ کھینچ کے پرے پھینک دیا اور پول میں چھلانگ لگا دی۔ دیکھتے دیکھتے وہ ڈوبتے بچہ کے پاس پہنچی اور اسے بغل میں دبا کر ایک ہاتھ سے پانی کا سینہ چیرتی ہوئی کنارہ پر آ گئی۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کر نادیہؔ کے ہاتھوں سے امام فخر الاسلامؔ صاحب کا چار سالہ بچہ سنبھال لیا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔ بیگم امامؔ نے جھپٹ کر بچہ کو گود میں بھر لیا اور بے تحاشہ اس کا منھ چوم چوم کر رونے لگیں۔

اُدھر نادیہؔ افتخار سوئمنگ پول کی منڈیر پکڑ کر باہر نکل آئی۔ اس کے کپڑے بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے اور ریشمی شلوار قمیص میں سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ فضا اک دم خاموش سی ہو گئی تھی۔ احمدؔ اب اپنی ماں کی گود میں ہلکی ہلکی سسکیاں لے رہا تھا اور امام صاحبؔ آنکھوں میں آنسو بھرے سارے بدن سے کانپتے ہوئے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کی نگاہ پڑتے ہی نادیہؔ کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بھیگے کپڑے نچوڑنے کی ناکام کوشش کی، امام صاحبؔ کی جانب سہمی سہمی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ سینہ پر باندھ کر مکان کی جانب چل دی۔ امام فخر الاسلام صاحبؔ نے آگے بڑھ کر اپنا چغہ نما کوٹ اتار کر اس کے کاندھوں پر ڈال دیا، پھر اس کو کھینچ کر سینہ سے لگا لیا۔ انہوں نے جھک کر کانپتے ہونٹوں سے نادیہؔ کی پیشانی کا بوسہ لیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل کر قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ معلوم نہیں کیوں آج ان کی نگاہیں نادیہؔ کی نظروں سے شرما سی رہی تھیں!

گلی منیہاراں کے ماٹصاب

کتب خانہ سے گذر کر ریلوے روڈ پر بڑے بازار کی جانب چلئے تو ٹھنڈی سڑک کا چوراہا ملتا ہے۔اس پر بائیں ہاتھ کو مڑ جائے تو یہ مختصر سی سڑک بڑے بازار میں لے جاتی ہے جہاں دونوں جانب کپڑے، کرانے اور جنرل مرچنٹ کی سیکڑوں دوکانیں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔قدم قدم پر مرچ مصالحہ کی تیز بواگر سانس لینا دوبھر کر دیتی ہے تو دوسری جانب رنگا رنگ، گنگا جمنی کپڑوں کے تھانوں سے آراستہ دوکانیں گاہکوں کو دعوت نظارہ دیتی ہیں اور اپنے اپنے ٹھیہ پر بیٹھے ہوئے دوکاندار خریداروں کو مختلف انداز میں دعوت خرید دیتے ہوئے دکھائی اور سنائی دیتے ہیں۔دوکانوں کے سائبانوں اور ان کو سر پر اٹھائے بانس کے نازک ستونوں سے بچتا، ٹکراتا لوگوں کا ہجوم، بیل گاڑی، اکّہ، تانگہ اور رکشہ کی بھاگ دوڑ ،سڑک پر آوارہ پھرتے ہوئے اور بے تکلف جا بجا پچی کاری کرتے ہوئے گائے بیل اور خلقت کی چیخ پکار عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔اسی سڑک پر ذرا آگے بڑھ کر بریلؔی کے مشہور سرمہ کی درجنوں دوکانیں ہیں جن میں لڑکے سل پر سرمہ پیستے اور چشمہ آنکھوں پر چڑھائے دوکاندار خریداروں سے سرمہ کی تعریف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

چوراہہ سے ٹھنڈی سڑک پر اگر دائیں طرف مڑ جایئے تو جلد ہی دوسرا نقشہ نظر آتا ہے۔چھوٹی چھوٹی میلی کچیلی دوکانیں اور سڑک پر دونوں جانب دری اور ٹاٹ بچھائے سستے کپڑوں اور پلاسٹک جوتوں، چپلوں اور برتنوں کے بیوپاری ان لوگوں کی ضروریات زندگی پوری کرتے نظر آتے ہیں جن کی جیب ہلکی اور مانگ سستی ہوتی ہے۔یہ غریب اور مزدور طبقہ کا بازار ہے۔ذرا اور آگے بڑھئے تو کنجڑوں کی دوکانوں کی پٹری ملتی ہے۔سبزی ترکاری خریدتے، دھکم مکا کرتے ہوئے لوگ سڑک پر پڑے گوبر سے بچتے بچاتے چلتے ہیں اور کبھی کبھی اس کی ذمہ داران گایوں سے بھی ٹکرا جاتے ہیں جو کنجڑوں کی نظر بچا کر سبزی ترکاری کے ڈھیروں پر منھ مارتی ہیں اور پھر نہایت صبر سے کمر پر کنجڑوں کے ڈنڈوں کی مار کھا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔

کنجڑوں کی دوکانوں سے چوتھائی میل آگے بڑھئے تو بائی ہاتھ کو ایک تنگ گلی بل کھاتی ہوئی نکل جاتی ہے۔اس کا نام گلی منیہاراںؔ ہے۔جیسا کہ گلی کے نام سے ہی ظاہر ہے، اس کے دونوں جانب دور تک درجنوں چوڑیاں بیچنے والے منیہاروں کی دوکانیں ہیں۔کچھ کچی، کچھ پکی اور کچھ لکڑی کے ڈھابہ نما دوکانیں رنگ برنگ چوڑیوں سے لدی پھندی نئی دلہن کی طرح سب کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔کچھ منیہار سڑک پر دری بچھائے اور مال کا ڈھیر لگائے بیٹھے نظر آتے ہیں۔جدھر نگاہ اٹھایئے چوڑیوں کی اس رنگین دنیا میں شہر کی بہو بیٹیاں دوکانوں کے تختوں، کرسیوں اور ٹھیوں پر بیٹھی چوڑیاں خریدتی اور ہنستی بولتی دکھائی دیتی ہیں۔ان کی کھنکھناتی ہوئی آوازیں، شرمیلی ہنسی اور چوڑیوں کی جھنکار مل کر نہایت خوشگوار فضا پیدا کرتی ہیں اور کنجڑے بازار سے گذر کر گلی منیہاراںؔ میں داخل ہوئیے تو تازگی اور فرحت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

اسی گلی منیہاراںؔ میں مسجد سے ملحق ہرے رنگ سے پتا ہوا مسلّم ہوٹل ہے جس نے کبھی اچھے دن دیکھے ہوں گے لیکن اب خاصہ خستہ حال ہے۔اس ہوٹل کی پہلی منزل کے پچھلے کمروں میں اس کا مالک محمد کاملؔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے اور اگلا کمرہ اور اس سے ملا ہوا چبوترہ ہوٹل کے دفتر، چائے خانہ اور اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔چبوترہ کے برابر سے ایک تنگ اور اندھا زینہ اوپر رہائشی حصہ میں لے جاتا ہے۔یہ زینہ ای کشادہ مگر بوسیدہ صحن میں کھلتا ہے جس کے چاروں طرف آٹھ دس کمرے بنے ہوئے ہیں۔ایک کونہ میں بیت الخلا اور اس سے ملا ہوا غسل خانہ ہے جس کے باہر پانی سے بھرے چند گندے مٹکے ایک لنگڑی گھڑونچی پر رکھے رہتے ہیں۔اسی مسلّم ہوٹل میں ماسٹر وکیل احمدؔ سے میری ملاقات ہوئی تھی!

میں ان دنوں علی گڑھؔ مسلم یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے بریلی پی ڈبلو ڈی (P. W. D.) میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔جب لکھنؔو ہیڈ کوارٹر سے میری تربیت کا تقرر نامہ علی گڑھؔ آیا تھا اور اس میں ماہانہ مختصر وظیفہ کی خوش خبری بھی منسلک تھی تو سارا گھر نہایت خوش ہوا تھا۔مجھے اپنا مستقبل نہایت شاندار نظر آنے لگا تھا اور بہت جلد انجینئر بن کر امیر ہونے کے خواب دن میں بھی دکھائی دینے لگے تھے۔والد صاحب میری طرح ہوائی محل بنانے کے قائل نہیں تھے۔خوشی تو ان کو بھی ہوئی تھی مگر ساتھ یہ فکر بھی تھی کہ اجنبی شہر میں کہاں ٹھیروں گا اور کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا؟ چنانچہ وہ میرے ساتھ بریلؔی آئے تھے اور خاصی تلاش کے بعد مسلّم ہوٹل میں میرے قیام وطعام کا انتظام کر

کے مجھے ہوشیاری سے رہنے اور کفایت شعاری سے خرچ کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے واپس علی گڑھ چلے گئے تھے۔ اور اب میں مسلم ہوٹل کا واحد ماہانہ کرایہ دار تھا۔ لوگ آتے رہتے تھے اور ایک آدھ دن وہاں گذار کر چلے جاتے تھے۔

ایک اتوار میں مسجد گلی منیہاراں سے ظہر کی نماز پڑھ کر ہوٹل واپس آیا۔ کمرہ کا تالا کھول ہی رہا تھا کہ برابر کا کمرہ کھلا اور کوئی صاحب باہر نکلے۔ شاید میں ان کی جانب متوجہ بھی نہ ہوتا اگر وہ خود ہی مجھ سے مخاطب نہ ہوتے۔

''السلام علیکم!'' انہوں نے نہایت پرتپاک آواز میں کہا۔ میں نے ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا کو شاید کوئی واقف کار ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے ایک اجنبی صورت صاحب کھڑے ہیں۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر مخملی رام پوری ٹوپی، عمر کوئی چالیس پینتالیس کی، کھلتا ہوا رنگ، خشخشی داڑھی، بڑی سی خمیدہ ناک پر چشمہ اور اس کے پیچھے سے مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں! بڑے تپاک سے بڑھ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور عادتاً'' میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے سوچا کہ یہ کون صاحب ہیں جو ایک اجنبی پر اس قدر مہربان ہو گئے ہیں؟

انہوں نے یہ طلسم خود ہی توڑا۔ ''معاف کیجئے گا! میرا نام وکیل احمدؔ ہے۔ آپ کے برابر کے کمرہ میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ آپ کو کل سے آتا جاتا دیکھ رہا ہوں۔ اندازہ سے آپ شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ میری بے تکلفی کا برا نہ مانئے گا۔'' وہ ایک سانس میں تقریر فرما گئے۔

میں کچھ بوکھلا گیا تھا۔ گھبرا کر بولا: ''نہیں نہیں! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ میرا نام سرورؔ ہے اور میں علی گڑھ سے حال ہی میں بریلی آیا ہوں۔ آیئے، کمرہ میں تشریف لایئے۔'' یہ دعوت بالکل رسمی سا تھا مگر جواب میں مسکراتے ہوئے وکیل احمدؔ صاحب بے تکلفی سے میرے کمرہ میں داخل ہو کر چارپائی کے پاس پڑی ہوئی اکلوتی کرسی پر دھم سے بیٹھ گئے۔ میں چارپائی پر ٹک کر ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ کیا کہوں اور اس بن بلائے مہمان سے کیسے گلوخلاصی حاصل کروں کہ انہوں نے صحن میں منڈلاتے ہوئے ایک لڑکے کو آواز دی:

''ارے بیٹا اِبّنؔ! ذرا نیچے سے دو کپ چائے تو لائیو! کہیو کہ میرے حساب میں لکھ دیویں۔''

اور وہ لڑکا ''اچھا چچا!'' کہتا ہوا بغیر ان کی جانب دیکھے ہوئے سیڑھیوں سے یوں اتر گیا جیسے یہ کام اس سے پہلے سیکڑوں مرتبہ انجام دے چکا ہو۔

اب وکیل احمدؔ صاحب نے ٹوپی سنبھالتے ہوئے میری جانب مڑ کر کہا: ''تو آپ بریلی میں نئے آئے ہیں۔ کیا شغل ہے؟ یہاں ہوٹل میں کیسے ٹھیرے ہوئے ہیں؟ کچھ بزنس وزنس کا چکر ہے کیا؟''

جی میں آیا کہ جھلا کر کہہ دوں کہ: ''حضت! آپ سے کیا مطلب کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں رہ رہا ہوں۔ اور پھر میری کرسی پر بیٹھ کر ایسی بے تکلفی سے جرح کرنے کی اجازت آپ کو کس نے دی؟'' مگر ان کی چمکدار آنکھوں اور مسکراتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر سخت جواب دینے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ابھی میں اپنا حدود اربعہ ان کو بتا ہی رہا تھا کہ اِبّنؔ ایک ٹرے میں دو چائے کی پیالیاں اور ایک پلیٹ میں نمک پارے رکھے داخل ہوا۔ وکیل احمدؔ صاحب نے بغیر نظر اٹھائے ایک ہاتھ سے اسے ٹرے میز پر رکھنے کا اشارہ کیا اور دوسرے سے یوں رخصت کیا:

''شاباش بیٹا! رکھ دے یہاں اس کو۔ اور دیکھ ایک پیالی چائے تو بھی جا کر پی لیجو۔ کہیو کہ میرے حساب میں لگا لیویں!''

لڑکے کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور وہ ''اچھا چچا!'' کہتا ہوا مسکرا کر چلا گیا۔

میری جانب وکیل صاحب پیالی اور نمک پارے بڑھاتے ہوئے بولے: ''لیجئے، چائے پیجئے سرورؔ میاں! تکلف نہ کیجئے۔ میں خود نہایت بے تکلف آدمی ہوں۔ یہیں قصبہ بھٹورا میں اسکول ٹیچر ہوں۔ بریلی آنا جانا رہتا ہے۔ یہاں آپ کا کوئی دوست تو بھلا کیا ہوگا؟ نیا شہر ہے، کوئی مدد چاہئے ہو تو ضرور بتایئے گا۔ خالی وقت آپ کا کیسے کٹتا ہوگا؟ اچھا یوں کریں کہ خالی وقت میں میرے کمرہ میں آ جایا کریں یا پھر میں خود آپ کی طرف آ جایا کروں گا۔ گپ شپ رہے گی اور کچھ شہر کی سیر تفریح بھی کرا دوں گا۔''

میں ان کے اس ناگہانی حملہ سے کچھ حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔ چائے اور نمک پارے کی رشوت کہئے یا ان کی محبت بھری باتوں کا اعجاز، وہ مجھ کو اچھے انسان لگے۔ یوں بھی اجنبی شہر میں آدمی کو کسی ہمدرد کی تلاش ہوتی ہے۔ بریلی میں میرا کوئی دوست آشنا نہیں تھا۔ دفتر سے واپس آ کر وقت گذارنا ایک مسئلہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی یہ بظاہر پرخلوص پیشکش میں نے بخوشی قبول کر لی اور وعدہ کیا کہ ملتا رہوں گا اور بوقت ضرورت ان سے مدد بھی لے لیا کروں گا۔ والد صاحب کی بریلی سے جاتے ہوئے تاکید کہ اجنبی لوگوں سے ہوشیار رہوں اور زیادہ گھلوں ملوں نہیں، وکیلؔ صاحب کے حق میں غیر ضروری معلوم ہوئیں۔ آدمی وہ باتونی تو یقیناً'' تھے لیکن میری ناتجربہ کار نظروں میں وہ اسی قدر بے ضرر بھی دکھائی دیتے تھے۔

پھر تو ان سے روزانہ ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں تو سرور میاںؔ ان کے لئے پہلے دن ہی ہو گیا تھا۔ وہ بھی وکیلؔ صاحب سے ماسٹرؔ صاحب ہوتے ہوئے دو چار دن میں ہی میرے لئے ماٹصابؔ ہو گئے۔ میں دفتر سے واپس آتا تو ہاتھ منھ دھو کر ان کی جانب چلا جاتا یا وہ میرے کمرہ آ جاتے۔ ادھر اُدھر کی گپ شپ ہوتی۔ وہ چائے اور نمک پارے منگاتے اور پیسے ہمیشہ اپنی جیب سے دیتے۔ میں کتنی ہی دینے کی کوشش کرتا لیکن وہ ہرگز نہ مانتے اور نہایت شفقت سے منع کر دیتے:

''سرورؔ میاں! مجھے شرمندہ نہ کریں! آپ مجھ سے چھوٹے ہیں۔ پھر یوں بھی آپ ابھی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ اگر باقاعدہ ملازمت ہوتی تو شاید مان بھی جاتا!''

ماٹصاب شطرنج کے بڑے شوقین تھے۔ ادھر میں بھی شطرنج کا عاشق تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بازی جما کرتی تھی۔ مگر جہاں رات کا دس بجا، بازی ادھوری چھوڑ کر ماٹصاب اٹھ کھڑے ہوتے: ''بس سرور میاںؔ! رات بہت ہو گئی ہے۔ کل آپ کو دفتر جانا ہے اور مجھ کو بھی ابھی عشا کی نماز پڑھنی ہے۔ کل ملاقات ہو گی۔ انشاءاللہ!''

جمعہ اور سنیچر کی رات کو البتہ دیر تک کھیلتے۔ چائے تھرماس میں بھر کر پاس رکھ لیتے، دور چلتا رہتا اور ساتھ ہی شطرنج کی بازی بھی! جیب میں ہمیشہ ایک نوٹ بک رہتی تھی جس میں شطرنج کے سیکڑوں نقشے بنا رکھے تھے۔ کبھی بازی کمزور پڑتی اور شکست کے آثار نظر آنے لگتے تو جھٹ جیب سے نوٹ بک نکال کر نقشے دیکھتے اور پھر یا تو فراخ دلی سے اپنا بادشاہ سرنگوں کر کے شکست کا اعتراف کر لیتے یا پھر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہتے: ''سرورؔ میاں! مات نہیں ہو سکتی! ہرگز نہیں ہو سکتی!'' اور چند چالوں میں بازی کا نقشہ ہی بدل دیتے۔ میں نے عام شاطروں کی طرح انہیں کبھی بازی جیت کر شیخی بگھارتے اور اچھلتے ہوئے یا ہار کر جھنجھلاتے اور منھ لٹکائے نہیں دیکھا تھا!

انہیں ہوٹل بازی اور سنیما کا بھی لپکا معلوم ہوتا تھا۔ دن کا بیشتر وقت چائے خانہ میں دو چار دوستوں کے ساتھ چائے پیتے پلاتے کٹتا تھا۔ لوگوں نے تاڑ لیا ہو گا کہ ماٹصاب دوستدار آدمی ہیں چنانچہ ہر وقت دو ایک اشخاص انہیں گھیرے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر معمولی پڑھے لکھے بے روزگار کلرک قسم کے لوگ تھے۔ ماٹصاب ان سے خندہ پیشانی سے ملتے، کچھ ان کی سنتے، زیادہ اپنی سناتے اور جیب سے چائے پلا کر ایسے خوش ہوتے جیسے بڑی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ کبھی کبھی کوئی شخص ان سے اپنی ضرورت کا رونا رو کر دس بیس روپے ''قرض'' مانگ لیتا۔ میں نے ماٹصاب کو کبھی کسی سے قرض کا تقاضہ کرتے یا کسی شخص کو اپنا قرض ادا کرتے ہوئے نہیں دیکھا! البتہ ہوٹل بازی ان کی نماز میں بالکل مخل نہیں ہوتی تھی۔ ظہر، عصر اور مغرب ہمیشہ مسجد منیہاںؔ راں میں باجماعت ادا کرتے اور مسجد سے نکل کر پھر ہوٹل میں آ بیٹھتے! گلی کا ہر شخص ان کا عاشق تھا۔ جدھر نکل جاتے ''ماٹصاب سلامالیکم'' کا شور مچ جاتا۔ تقریباً ''ہر سنیچر مجھے پکڑ کر بضد سنیما دکھانے لے جاتے۔ ٹکٹ ہمیشہ وہ دونوں کا فرسٹ کلاس کا لیتے۔ ہال میں بیٹھ کر فلم کے دوران مونگ پھلی سے تواضع کرتے اور چھلکے بڑے اہتمام سے اپنے رومال میں جمع کرتے جاتے۔ سنیما سے نکل کر انہیں وہ کوڑہ کے ڈبہ میں ڈال کر رومال جھاڑتے اور تہ کر کے جیب میں رکھ لیتے۔ بریلیؔ شہر میں یقیناً'' وہ واحد شخص ہوں گے جنہیں سنیما ہال کی صفائی کا اس قدر خیال تھا!

میری بے تکلفی ماٹصاب سے بڑھی تو ایک دن میں نے برسبیل تذکرہ ان سے پوچھا: ''ماٹصابؔ! آپ بریلیؔ میں کرتے کیا ہیں؟ دن بھر تو آپ ہوٹل میں گذارتے ہیں اور شام تفریح اور سنیما میں! میں نے آپ کو کبھی کچھ کرتے نہیں دیکھا!''

میرے سوال پر ماٹصابؔ بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور اتنا ہنسے کہ آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بمشکل خود پر قابو پا کر رومال سے آنکھیں پوچھتے ہوئے بولے: ''سرورؔ میاں! آپ بھی کیا قصہ لے بیٹھے! کیا کریں گے پوچھ کر؟ پھر کسی موقع سے بتا دوں گا۔ تو آیئے، ہو جائے ایک بازی؟'' پھر ہوٹل کے لڑکے کو آواز دی:

''ارے بیٹا اِبّن! ذرا دو کپ چائے تو لائیو! کہہ دیجیو کہ میرے حساب میں لکھ لیویں!''

اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی لیکن میری خلش نہیں گئی۔ کئی بار پھر ان سے پوچھا اور ہمیشہ ہنسی سے اسی طرح بے حال ہوتے دیکھا۔ گلی منیہاںؔ راں میں کئی لوگوں سے پوچھا مگر اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ماٹصابؔ ہر سال تقریباً'' انہیں دنوں میں آتے ہیں اور مسلم ہوٹلؔ میں اسی انداز میں ایک ماہ رہ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی ان کا یہ راز معلوم کرنے کا نہ تو کسی کو شوق تھا اور نہ ہی ضرورت! ماٹصاب ان سے لیتے ہی کیا تھے جو کوئی ان کے گلے پڑتا؟

دیکھتے دیکھتے تقریباً'' ایک ماہ گذر گیا۔ ایک شام ماٹصابؔ میرے کمرہ میں آئے تو ان کی سکہ بند مسکراہٹ میں وہ پہلی سی شگفتگی اور بے ساختگی نہیں تھی۔ آنکھیں بھی کچھ اداس اداس نظر آ رہی تھیں۔ علیک سلیک کر کے کرسی پر بیٹھ چکے تو میں نے پوچھا: ''ماٹصابؔ! خیریت تو ہے؟ بڑے چپ چپ نظر آ رہے ہیں آج؟''

انہوں نے پہلو بدل کر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: ''سرورؔ میاں! میں کل بھٹورؔا جا رہا ہوں۔ اب اگلے سال ہی واپس آؤں گا۔ آپ اس وقت تک کہیں انجینئر ہو کر جا چکے ہوں گے۔ آپ کے ساتھ وقت بہت اچھا گذرا۔ اب خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو!''

میں بھی یہ خبر سن کر ملول ہو گیا۔ زندگی میں ایسے مخلص اور ملنسار لوگ کہاں ملتے ہیں؟ ماٹصابؔ نے چند ہفتوں میں ہی اپنی بے لوث شفقت اور محبت سے میرا دل میں گھر کر لیا تھا۔ میں نے ان سے اپنے ملال کا ذکر کیا اور خط و کتابت قائم رکھنے کا وعدہ بھی کیا۔ اپنے تئیں میں نے انہیں بڑا اطمینان بخش جواب دیا: ''ماٹصابؔ! دنیا بہت ہی مختصر ہے۔

کون جانے پھر کہاں آپ سے ملاقات ہو جائے۔ آپ کی مہربانیاں مجھ کو ہمیشہ یاد رہیں گی!''

ماٹصابؔ مسکرا کر خاموش مجھے دیکھا کئے جیسے انہیں میری باتوں اور وعدوں کے کھوکھلے پن کا پورا احساس ہو۔ وہ مڑ کر ابّنؔ کو آواز دینے ہی والے تھے کہ میں نے پوچھا:

''ماٹصابؔ! اب تو آپ جا ہی رہے ہیں! پھر ملاقات جانے کب ہو اور کیا پتہ کہ کبھی نہ ہو۔ اب تو بتا دیں کہ ہر سال بریلی میں آپ کیا کرتے ہیں جو آنا ضروری ہے؟''

اس سوال پر ماٹصابؔ نے اس دن قہقہہ نہیں لگایا۔ صرف مسکرا کر چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے: ''سرورؔ میاں! بات کوئی ایسی بڑی نہیں ہے۔ بتائے دیتا ہوں۔ میں ہر سال آس پاس کے قصبوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو میٹرک پاس کروانے کے لئے بریلی آتا ہوں!''

میں نے حیرت سے ہکلا کر کہا: ''جی، میٹرک پاس کروانے؟ یعنی کیا مطلب؟ ماٹصابؔ! یہ بات تو میرے پلّے نہیں پڑی!''

اس مرتبہ ماٹصابؔ کا پرانا قہقہہ بے اختیار نکل گیا۔ ہنستے ہنستے کرسی سے جھول گئے۔ آنکھوں سے بے تحاشہ پانی جاری ہو گیا۔ بمشکل خود پر قابو پا کر آنکھیں رومال سے پوچھیں، دو چار گہری گہری سانسیں لیں اور پھر مجھ سے کہنے لگے:

''بھئی سرورؔ میاں! بات یوں ہے کہ کوئی دس سال پہلے ماسٹری کرتے کرتے میرے دماغ میں ایک بات آئی۔ میں قصبہ بھٹورؔہ اور آس پاس کے چار چھ قصبوں میں گیا اور وہاں میٹرک کے طلبا کے ماں باپ سے ملا۔ میں نے ان سے یوں کہا کہ میرے ذاتی تعلقات اس سال کے میٹرک امتحان کے تمام ممتحنوں سے ہیں اور طلبا کو ذاتی سفارش سے ہائی اسکول پاس کروا سکتا ہوں۔ اس خدمت کی فیس میں نے پانچ ہزار روپے بتائی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میٹرک کی ہمارے یہاں کتنی اہمیت ہے کہ اس کے بغیر سرکاری ملازمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ تو بھائی! درجنوں لوگوں نے مجھ کو پانچ پانچ ہزار روپے فیس دے دی۔ قصبہ میں ساکھ تو میری تھی ہی چنانچہ اجنبی لوگوں نے بھی مجھ کو سفارشی بنا لیا۔ جب ہائی اسکول کے امتحانات ختم ہو گئے تو میں کچھ دنوں کے بعد قصبہ کے لوگوں سے یہ کہہ کر چل دیا کہ ممتحنوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ ایک ماہ یہاں مسلّم ہوٹل میں گذار کر واپس چلا گیا اور پوچھنے والوں کو یقین دلایا کہ کام ہو جائے گا۔ دو تین ماہ بعد جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو ظاہر ہے کہ کچھ طلبا پاس تھے اور کچھ فیل۔ جو لڑکے لڑکیاں فیل ہو گئے، میں ان کے والدین سے جا کر ملا اور بہت افسوس ظاہر کرتے ہوئے ان کے پانچ ہزار روپے یہ کہہ کر واپس کر دئے کہ: بھائی! میں نے بڑی کوشش کی مگر آپ کے بچہ کا پرچہ اس قدر خراب تھا کہ پاس ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی! مجھے بہت افسوس ہے۔ یہ رہے آپ کے پانچ ہزار روپے۔ میں ان کو قبول نہیں کر سکتا ہوں کیونکہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔: جو لڑکے اور لڑکیاں پاس ہو گئے، ان کے ماں باپ میرے گھر مٹھائی لے کر آئے اور بہت بہت شکریہ ادا کیا!''

''سرورؔ میاں! دیکھتے دیکھتے میری ایمانداری کی خبر آگ کی طرح دور دور تک پھیل گئی کہ: بھائی! ماٹصاب تو فیل ہونے والوں کے روپے واپس کر دیتے ہیں:! اب ہر سال گھر بیٹھے بٹھائے دور دور سے سیکڑوں لوگ میرے پاس اسی خدمت کے لئے آتے ہیں! فیس البتہ اب بڑھ کر دس ہزار روپے ہو گئی ہے۔ آخر اس زمانہ میں سستی کون سی چیز ہوئی ہے پچھلے سالوں میں؟ تو بھئی اب میں چلوں کیونکہ امتحان کا سیزن ختم ہو گیا ہے!''

ماٹصابؔ نے قصہ سنا کر پھر ایک قہقہہ لگایا اور رومال سے آنکھیں پوچھتے ہوئے آواز دی: ''ارے بیٹا ابّنؔ! ذرا نیچے سے دو کپ چائے تو لائیو۔ کہیو کہ میرے حساب میں لگا لیویں!''

تھپڑ

اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے فادر جانؔ نے گھما کر زنّاٹے کا ایک تھپڑ میرے گال پر رسید کر دیا ہو! میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور فضا میں نیلے پیلے تر مرے ناچنے لگے۔ میرا چہرہ شرم اور کرب سے تمتما گیا، پیشانی پسینہ سے نم ہوگئی اور سارا بدن یوں کانپنے لگا جیسے اس کا سارا رست کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ اس تھپڑ کی گونج میرے رگ و پے میں کوندرہی تھی اور فادر جانؔ کی میٹھی آواز اپنے دامن میں کتنے ہی زہریلے نشتر لئے میرے ذہن کے کسی گوشہ میں برابر مجھ پر ہنسے جارہی تھی، ہی ہی ہی! ہاہاہا! اور میں مجبورو ناچار کھڑا یہ ہنسی سن رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ گھٹن اور ذہنی کرب سے گھبرا کر جب بڑی ہمت کر کے نظریں اٹھائیں تو فادر جانؔ کے چہرہ پر ہنسی یا تمسخر کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ ان کا چہرہ خوبصورت داڑھی کے فریم میں ہمیشہ کی طرح سکون اور اطمینان میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کی سنجیدہ آنکھوں میں تصنع یا بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ بائیں ہاتھ میں حسب معمول بائبل تھامے تھے اور دائیں ہاتھ سے میری کہنی تھامے جیل خانہ کے دروازہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں میں ایک مجبور اور بے اختیار قیدی کی طرح سر جھکائے میں دروازہ تک پہنچ گیا۔ جیل خانہ کا آہنی دروازہ کھلا اور ایک مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس نے ہم دونوں کو نگل لیا۔ اور وہ ہنسی بھی میرے دل ودماغ کو کچوکے لگاتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے اندر آگئی، ہی ہی ہی! ہاہاہا!

امریکہ میں کئی بڑے بڑے جیل ہیں جہاں مشہور زمانہ اور بدنام مجرم قید میں رکھے جاتے ہیں۔ ان جیلوں کے بارے میں حکومت کا دعوہ ہے کہ ان سے کوئی قیدی کبھی بھاگ نہیں سکا ہے۔ لمبی لمبی قیدوں والے ان مجرموں میں کوئی قاتل ہے تو کوئی ڈکیت، کوئی بینک لوٹنے میں ماہر ہے تو کوئی معصوم عورتوں اور بچوں کو اپنی غیر فطری قوتوں اور خواہشات کا عمر بھر شکار بناتا رہا ہے۔ یہ قیدی ناقابل اصلاح تصور کئے جاتے ہیں اور عدالتی نظام نہ صرف انہیں عام مجرموں کی سی مراعات نہیں دیتا ہے بلکہ ان کے معاملات کو خاصی سختی سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ ان جیل خانوں میں قیدیوں کی روزمرہ کی زندگی بندھے ٹکے قاعدوں اور ضابطوں کی پابند ہوتی ہے۔ کھانے پینے، کام کاج، لائبریری، چرچ، ورزش، مختصر یوں سمجھئے کہ ہر شعبہ کے اوقات بندھے ہوتے ہیں اور یہ انسانی زندگیاں گھڑی کی مانند کٹا کرتی ہیں۔ قیدی اگر جیل میں دنگا فساد کریں یا نگہبان سپاہیوں سے منھ زوری کریں تو انہیں گرفتار کر کے قید تنہائی میں ڈال دیا جاتا ہے جسے قیدی اپنی اصطلاح میں ''کال کوٹھری'' (Black Hole) کہتے ہیں۔ تقریباً ''دس فٹ لمبی اور اسی قدر چوٹی کوٹھری میں ایسے منھ زور قیدی کو چند ہفتوں کے لئے مقید کر دیا جاتا ہے۔ کوٹھری میں ایک جانب ایک بستر اور دوسرے کونہ میں ایک کموڈ ہوتا ہے۔ سر پر ایک تیز ننگا بلب چوبیس گھنٹے جلتا رہتا ہے۔ ناشتہ، کھانا وغیرہ دروازہ میں بنی ایک کھڑکی کھول کر خاموشی سے سپاہی رکھ جاتا ہے۔ ایسے قیدیوں کو کسی سے ملاقات یا بات چیت کی مطلق اجازت نہیں ہوتی ہے۔ ریڈیو اور اخبار وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف آدھے گھنٹہ انہیں مسلح سپاہی کی نگرانی میں جیل کے میدان میں چلنے پھرنے اور بھاگ دوڑ کی اجازت ہوتی ہے۔ یہی ان کی روزانہ کی ورزش اور چہل قدمی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ ہوتے ہیں اور ان کی قید تنہائی!

اٹلانٹا (Atlanta) شہر میں بھی ایک ایسا ہی جیل ہے جہاں تقریباً ''ڈیڑھ ہزار قیدی اپنی اپنی قید کی میعاد پوری کر رہے ہیں۔ چونکہ امریکہ میں قیدیوں کے بھی چند بنیادی حقوق ہوتے ہیں، حکومت کی جانب سے جیل میں لائبریری، کھیل کود، اور مختلف مذاہب کی تعلیم کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ باہر سے عیسائی، یہودی اور دوسرے مذہبوں کے لوگ قیدیوں کی مذہبی ضروریات پوری کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے وہاں مسلمان قیدیوں کہ اپنی مذہبی ضروریات خود ہی پوری کرنی پڑتی تھیں۔ جیل کے نام سے ہی باہر کا مسلمان گھبراتا تھا۔ دوسرے ممالک سے امریکہ آکر بسے ہوئے مسلمان اپنے اپنے ملکوں کے جیلوں کے حالات سے واقف تھے اور امریکہ میں بھی انہیں حالات کا قیاس کر کے اور یہاں کی زبان، معاشرہ اور قوانین سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے جیل کے قریب بھی پھٹکنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ گویا جیل جا کر کسی مسلمان قیدی کی خدمت یا مدد کرنا خود جیل جانے کے برابر تھا! شہر میں مقامی سیاہ فام مسلمانوں کیا اور غیر ملکی مسلمانوں کی خاصی بڑی آبادی تھی اور شہر کے مختلف حصوں میں کئی مسجدیں بھی آباد تھیں۔ نمازیں ہوتی تھیں، عید، بقرعید کی تقاریب اور رمضان کے روزوں اور افطار کا بھی اہتمام تھا، عید میلاد النبی ﷺ کا جلسہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا لیکن اس آزاد دنیا کے مسلمانوں کا جیل کے مسلمان قیدیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بیرون ملک سے امریکہ جا کر آباد ہونے والے مسلمان اپنے ساتھ وہ سارے تعصّبات اور تنازعات لے کر آئے تھے جن سے ان کی زندگیاں اپنے اپنے ملکوں میں آلودہ رہیں تھیں۔ شیعہ سُنّی اختلافات، وہابی کون ہے اور قادیانی کون، نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے جائیں کہ ناف پر، جنت میں کون جائے گا اور کون جہنم کا ایندھن بنے گا، عورتیں مسجد میں کس دروازہ سے داخل ہوں، غرض کہ اسی قسم کے مسائل تمام تقریروں اور مباحثوں کے موضوع ہوا کرتے تھے۔ مسجدوں میں سیاست، الیکشن، چودھراہٹ اور چندہ مختلف